لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا ہے۔ (سورۃ التین: آیت ۴)

امّت کے روشن چراغ

جلد سوم

حسبِ ایماء

شیخ طریقت حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی ایم ڈی چرتھاولی حفظہ اللہ

خلیفہ ومجاز حضرت حاذق الامتؒ پرنامبٹ (خلیفہ ومجاز حضرت مسیح الامتؒ بلال آبادی) بانی ومہتمم دارالعلوم محمدیہ وخانقاہ رحیمی

مرتب

ابوعفان ڈاکٹر محمد سفیان عالم رحیمی

رحیمی شفاخانہ بنگلور کرناٹک

ناشر

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب : امت کے روشن چراغ (جلد سوم)

حسبِ ایماء : حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی حفظہ اللہ

مرتب : ابوعفان ڈاکٹر محمد سفیان عالم رحیمی

کتابت وتزئین : حبان گرافکس بنگلور

صفحات : 244

تعداد : گیارہ (۱۱۰۰) سو

قیمت : .....روپئے

ناشر :

مرتب کا مکمل پتہ

RAHEEMI SHIFA KHANA

#248, 6th Cross, Gangondanahalli Main Road,

Nayandhalli Post, Maysore Road

BANGALORE - 560039 (INDIA)

Ph.: 080-23180000, 23397836/72

www.raheemishifakhana.com

E-mail.: raheemishifakhana@yahoo.com

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
1	ثواب اور انتساب	9
2	پیش لفظ	10
3	مقتدائے زماں شیخ عبدالقدوس قطب عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ	11
	شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت مبارک	12
	گنگوہ شریف میں سکونت	14
	الکھ داس بن کر اسلام کی تبلیغ کی	15
	شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں	18
	اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کا راستہ	19
	شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد	20
	بابر نے حضرت قطب عالم سے ملاقات	22
4	شیخ ابوسعید گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ	24
	طوائف کی باتوں کا دل پر اثر	25

	شیخ ابوسعید کا مجاہدہ	26
	شیخ نظام الدین سے شیخ عبدالقدوس کو خواب میں دیکھا	27
5	امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ	29
	امام ربانی کا سلسلہ نسب	31
	شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں امام ربانی	32
	گنگوہ سکونت اختیار کی	33
	مولانا گنگوہی کے والد مولانا ہدایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ	35
	مولانا ہدایت احمد صاحب کے پیر و مرشد شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ	36
6	حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ	37
	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تبلیغی کام کرنے والوں کے لئے مشورہ	38
	سادگی ایمان کی علامت	38
	شان عبدیت	39
7	حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ	40
8	امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ	44
9	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ	51
10	شاعر مشرق علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ	60
11	شیخ الادب مولانا اعزاز علی صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ	68
12	مبلغ اسلام مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ	74
	بانی تبلیغی تحریک کے بارے میں اکابر علماء کے تاثرات	75
	بانی تبلیغ ایک جید عالم اور مرشد وقت بھی تھے	76
	تبلیغی تحریک کے آغاز کا پس منظر	77

	تبلیغی تحریک کی ابتداء	77
	تبلیغی فارمولہ حکیم الاسلام کی نظر میں	78
	تبلیغی فارمولہ دوررس نتائج کا حامل ہے	78
	تبلیغی تحریک کا مقصد	79
	راہ خدا میں ذلیل ہونا ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتا ہے؟	80
	مختلف طرز فکر اور طریقِ کار رکھنے والوں کا اعتراف	80
	تبلیغی تحریک پر نصرت الٰہی کا فیضان	82
	تبلیغی تحریک کے حیرت انگیز نتائج کا ایک دلفریب منظر	83
	اصولوں کی پابندی میں اس تحریک کی کامیابی کی ضمانت ہے	83
	تبلیغی اجتماعات کے اغراض ومقاصد	84
	خلاصہ کلام	85
13	مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریا آبادی	86
14	بحرالعلوم حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود رحمۃ اللہ علیہ	104
15	پیر طریقت قلندر زماں مصطفیٰ کامل رشیدی اعرابی رحمۃ اللہ علیہ	115
16	حاذق الامت عارف باللہ حضرت مولانا حکیم زکی الدین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ	136
	علم وحکمت کے دریا بہادیئے	137
	خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ	138
	کچھ یادیں کچھ باتیں	139
	حاذق الامت کا مختصر سوانحی خاکہ	142
	آہ! حاذق الامت رحمۃ اللہ علیہ	144
	شیخ کی زیارت کیلئے اچانک جلال آباد کی حاضری اوہ حکیم صاحب ہیں!	148

	اپنے شیخ سے ملاقات کیلئے دور دراز کا سفر	150
17	حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ	152
18	مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ	159
	رابطہ اسلامی کی بنیاد	161
	ہندوستان کی تقسیم کے مخالف علماء	162
	شیخ ندوی کا حکومت کے خلاف احتجاج	163
	مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد حیات	165
	شیخ ندوی کا قلم وہی تھا	166
	مولانا علی میاں دعوتِ اسلامی کے مبلغ	166
19	مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی ذاکر حسن عبیدی رحمۃ اللہ علیہ پھلتی	168
	مولانا عبیدی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات نصف صدی پر محیط	169
	جمعہ مسجد میں مولانا کا تقرر	169
	مولانا کی سحر بیانی	171
	۴۵ سالہ قرآنی خدمات کا حاطہ مشکل ہے	172
	مولانا عبیدی رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا اہم کارنامہ	174
	بدعات اور خرافات کی مخالفت	174
	مولانا عبیدی رحمۃ اللہ علیہ کو سپاس نامہ	176
20	محی السنہ حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ	179
	حضرت والا کی ایک قیمتی نصیحت	181
	خدا کی معرفت اور آخرت کی یاد	182
	نصیحت اور مثال بظاہر مختصر ہے	183

	ظاہر کا اثر باطن پر	184
	مہکری کی شاہانہ بود و باش	186
	مہکری صاحب کی دور اندیشی	187
	ایم جی مہکری کی آخری دم تک خدمات	188
21	پیکر علم و عمل حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ	190
	مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ طالب علمی	191
	مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے	193
	مددگار مہتمم مقرر ہوئے	193
	دارالعلوم میں ۳۰ سالہ خدمات	194
	نماز با جماعت کے لئے پہلی صف میں	195
	شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ	197
	شیخ نصیر احمد کا وطن مولود	199
	تقسیم ہند کی داستان الم	200
	شیخ کی اہم خصوصیت	201
	درس کے دوران ظریفانہ گفتگو	202
	قرآن کریم کے آپ عاشق تھے	204
	ختم بخاری کی یادگار مجالس	205
22	حضرت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ	207
	اپنے اکابر سے خاص نسبت	208
23	پیکر علم و عمل مولانا محمد حنیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سہارنپوری	210
24	تیری نیکیاں باقی تیری خوبیاں زندہ	213

	والدین کا رشتہ	214
	مرکزِ محبت منبع شفقت دادای اماں	217
25	ولی کامل منشی محمد شفیع بہادر پوری رحمۃ اللہ علیہ	222
26	چرتھاول کے تین بزرگ	228
	حافظ سعید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ	228
	حضرت منشی عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ	229
	قاری عبدالقدوس صاحب قاسمی رحمۃ اللہ علیہ	230
27	علمائے دیوبند	232
	مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ	233
	حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ	234
	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوالات	235
	مخالفین سے سلوک	236
	مولانا احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعظیم	237
	شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع	238
	جذبات کو پی کر فرمایا	238
	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمان ہونے کا اقرار کیا	239
	حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت اور موعظت	240
	جھوٹ کا چراغ نہیں جلتا	243

☆☆☆

بحمداللہ تعالیٰ ''اُمت کے روشن چراغ'' جلدسوم کا

ثواب اورانتساب

امام الائمہ رأس الفقہ محدث کبیر امامِ اعظم حضرت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطار رحمۃ اللہ علیہ کے نام معنون کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں، جن کا زہد وتقویٰ، فہم وفراست، حکمت ودانائی اپنی مثال آپ ہیں، جنہوں نے اجتہاد واستنباط اور دروسِ حدیث وفقہ میں مشغول رہ کرسات ہزار قرآنِ کریم تلاوت فرمائے، جن کے اجتہادی مسائل تقریباً بارہ سوسال سے تمام عالم اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں، جو بڑی بڑی اسلامی حکومتوں کے قانونِ سلطنت وقانونِ عدل مقرر ہوئے اور آج بھی پچھتّر فیصد سے زیادہ مسلم طبقہ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے فیوض وبرکات اجتہاد واستنباط سے مستفیض ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے سچے عاشقِ رسول وعاملِ سنت نبوی ﷺ پر لاکھوں رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے، آمین!

خادم آستانہ حضرت حاذق الامتؒ

محمد ادریس حبان رحیمی چرتھاولی

خانقاہِ رحیمی دارالعلوم محمدیہ بنگلور

مورخہ ۲۷/جنوری ۲۰۱۴ء

مطابق ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ بروز پیر

پیش لفظ

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمُ . اَمَّا بَعْد

''امت کے روشن چراغ'' جلداول ودوم مکمل ہوئیں تو احقر کے دل میں آیا کہ کیوں نہ اس کی مزید ایک اور جلد تیار کرکے اس سعادت میں خود کو بھی شریک کرلیا جائے۔ چنانچہ خسر محترم مشفق ومکرم شیخِ طریقت حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی مدظلہ العالی سے اجازت طلب کرنے کے بعد مجالسِ رحیمی میں کبھی کبھی پڑھ کر سنائے گئے مضامین اور اسلاف واکابر نیز چنندہ شخصیات سے متعلق تحریرات کو ''امت کے روشن چراغ'' جلداول ودوم کے مشابہ جمع وترتیب دے کر حضرت والا حفظہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا جسے آپ نے سراہا اور خال خال نظرفرما کر اشاعت کی اجازت عنایت فرمائی، اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے، عوام وخواص کے لئے نافع اور ذریعہ آخرت بنائے، آمین!

والسلام

ابوعفان ڈاکٹر محمد سفیان عالم رحیمی

مورخہ ۲۷/جنوری ۲۰۱۴ء

مطابق ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ بروز پیر

مقتدائے زماں

شیخ عبدالقدوس قطب عالم گنگوہیؒ [1]

ہندوستان میں صوفیائے کرام کی تاریخ اس زبان وتہذیب کی تاریخ ہے جو مسلمان صوفیوں کے لسانی کارناموں سے لبریز ہے۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت شرف الدین یحییٰ منیریؒ، حضرت شاہ برہان الدین غریبؒ، حضرت بندہ نواز گیسودرازؒ، حضرت بہاء الدین باجنؒ جیسے اکابر صوفیاء سے ہوتا ہوا روحانیت، نیکی اور فلاح کے ابدی پیغام کا نور اس ہندوستانی زبان کے ساتھ اس سرزمین کو روشن کرتا ہے جو ہندی واردو اور مشترک ہندو مسلم تہذیب کا گہوارہ بنی۔

صوفیائے کرام کے اس لامتناہی سلسلے کی ایک نہایت اہم روحانی شخصیت حضرت شیخ عبدالقدس گنگوہیؒ ہیں۔ آپ صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے، آپ سلوک وعرفان کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ جو کچھ فرمادیتے ویسا ہی واقع ہوتا۔ شریعت محمدی ﷺ کے پابند حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ درویش کامل اور عارف

[1] جامع تاریخ ہند، مطبوعہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

باللہ تھے۔ سماع سے آپ کو اس درجہ شغف تھا کہ اکثر دورانِ محفل آپ پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی اور والہانہ انداز میں آپ کی زبان مبارک سے جو کچھ صادر ہوتا وہ ہوکر رہتا۔ فارسی شعروادب میں آپ کو غیر معمولی دسترس حاصل تھی۔ فارسی میں قدوس تخلص کرتے تھے۔ آپ کا فارسی کلام معروف وتصوف کرتے تھے۔ آپ کا فارسی کلام معرفت وتصوف کا شاہکار ہے۔ آپ کی بزرگی وکرامات کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ بلالحاظ مذہب وملت ہزراہا بندگان خدا آپ کی دعاؤں سے مستفیض ہوتے تھے، لیکن اس عظمت وبزرگی سے الگ آپ کی ایک اور شناخت بھی نہایت نمایاں تھی وہ تھی ہندوستانی بھاشا میں ان کی روحانی شاعری۔ آپ بلاشبہ اس عوامی بھاشا کے عظیم شاعر تھے جو ان کے ہم عصر گرونانک کے زمانے میں ملک کے مختلف حصوں میں مقامی اثرات کے ساتھ پروان چڑھ رہی تھی۔ کبیر اور گرونانک کی طرح وہ عہد آفریں صوفی تسلیم کئے گئے۔ ہندی زبان بھلا شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ یعنی مہمان ''صوفی کوی الکھ داس جی'' کو کیسے فراموش کرسکتی ہے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہی عرف الکھ داس کس پایہ کے بزرگ تھے اس کا اندازہ عہد اکبری کے مورخ عبدالصمد خواہر زادہ ابوالفضل علامی کی کتاب ''اخبار الاصفیاء'' میں ان کے لئے برتے گئے القابات 'مجتہد وقت' اور 'مقتدائے زماں' سے لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی کے ساتھ ساتھ بھاشا کا مزاج ان پر اس قدر حاوی تھا کہ بات چیت میں برجستہ دوہے اور چھندان کی زبان سے نکلتے تھے۔

شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت مبارک

آپ کی ولادت 1455ء میں ردولی (ضلع بارہ بنکی) میں ہوئی۔ آپ کے والد شیخ اسماعیل ردولی میں رہتے تھے۔ ان کے دادا شیخ صفی الدین حضرت امیر سید

اشرف صمنانیؒ کے مرید تھے۔آپ کے خاندان کا نسبی سلسلہ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے ملتا ہے۔تذکار سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کی تعلیم کا سلسلہ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ان کا جھکاؤ بچپن سے ہی باطنی علوم اور روحانیت کی طرف تھا۔ہوش سنبھالنے پر وہ زیادہ وقت ولی کامل حضرت شیخ عبدالحق ردولویؒ کے مزار شریف پر گزارتے، وہاں جھاڑو دیتے اور دوسری خدمات انجام دیتے۔ایک دن وہ کتاب 'کافیہ' ایک ہاتھ میں لیے مزار شریف کی صفائی کررہے تھے، اچانک قبر شریف سے ''حق حق'' کی ایسی آواز سنائی پڑی کہ آپ ازخود رفتہ ہوگئے۔انہیں حضرت شیخ سے روحانی فیض حاصل ہوگیا۔اسی دن سے لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا اور ریاضت ومجاہدات میں مشغول ہوگئے۔آپ اپنے وقت کے عظیم صلحاء، حضرت شیخ محمد بن عارفؒ اور حضرت قاسم اودھیؒ کے مرید ہوئے اور خرقہ خلافت حاصل کئے۔جب شیخ صاحب مدارج سلوک کی تکمیل تک پہنچے تو حضرت شیخ عبدالحق ردولویؒ نے بشارت دی ''تجھے ولایت بالادست عطا کی'' مرشد روحانی کی جانب سے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔آپ فنافی اللہ تھے اور شریعت وسنت کے پوری طرح پابند تھے۔آپ نے شادی کی، ان کی اہلیہ نے بھی درویشی وفقیری کا مزاج پایا۔آپ کے سات فرزند ہوئے۔جن میں شیخ حمید الدین، شیخ الکبیرؒ، اور شیخ رکن الدینؒ اپنے وقت کے مشہور عالم دین اور زاہد ہوئے لیکن ایک پوتے شیخ عبدالنبی ہندوستانی تاریخ کی اہم شخصیت بنے۔حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور عالم کتاب ''اخبارالاخیار'' اور دیگر کتب تواریخ میں شیخ عبدالنبی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ اسلامی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جوانی میں زیارت حرمین سے مشرف ہوئے۔مکہ مکرمہ پہنچ کر بعض فقہائے کرام سے علم حدیث حاصل کرکے اپنے وطن تشریف لائے اور پھر زہد وعشق میں مشہور ہوئے۔اپنے والد اور چچا صاحبان سے مسئلہ توحید وسماع پر گفتگو کی، آپ کے والد

نے سماع کے جواز میں ایک کتاب لکھی تھی۔شیخ عبدالنبی نے اس کے خلاف ایک رسالہ لکھا۔اس سے انہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی لیکن یہی رسالہ ان کی شہرت کا باعث بنا۔اکبر کے عہد میں شیخ صاحب صدرالصدور بنائے گئے۔بادشاہ کو آپ سے بیحد عقیدت تھی، لیکن شیخ عبدالنبی درباری علماء کی رقابت کا شکار ہوئے۔ابوالفضل اور فیضی ان کی شہرت اور عزت کی وجہ سے سخت مخالف ہوگئے۔ان پر غبن کا الزام لگا اور قید کئے گئے۔بادشاہ نے ٹوڈرمل کو معاملے کی جانچ سپرد کی، لیکن اسی دوران ابوالفضل نے رات کے وقت قید خانے میں انہیں قتل کرادیا۔دہلی کی مشہور مسجد عبدالنبی جہاں آج کل جمعیۃ علماء ہند کا دفتر ہے انہی کی تعمیر کردہ ہے۔

گنگوہ شریف میں سکونت

آپ کا زمانہ سلطان سکندر لودھی کا دور حکومت تھا۔بادشاہ کے دربار کا نہایت مقتدر امیر عمر خاں کاشی آپ کا بیحد معتقد تھا۔اسی کی درخواست پر آپ بمعہ اہل خانہ دہلی تشریف لے گئے اور شہر سے قریب شاہ پور میں سکونت اختیار کی۔شاہ آباد افغانوں کی بستی تھی۔جب بابر نے حملہ کیا تو افغانوں کے اس مرکز کو برباد کردیا۔اس وقت آپ نے اپنے متعلقین کے ساتھ نقل مکانی کرکے سہارنپور کے قصبہ گنگوہ میں رہائش اختیار کرلی اور تاحیات وہیں رہے اور وہیں سے آپ نے بزرگی، کشف وکرامات اور شاعری کا الکھ جگایا۔صاحب 'سیرالاقطاب' کا بیان ہے کہ ایک بار آپ موضع چھاج پور میں مقیم تھے، عین اس وقت جب آپ عبادت الٰہی میں مشغول تھے، اچانک چونکے اور بلند آواز میں فرمایا'' گاؤں کے سب لوگ اپنا مال واسباب بچوں کو لے کر گھروں سے باہر نکل آئیں، یہاں آگ لگنے والی ہے۔'' لوگ گھبرا کر اپنے گھروں سے نکل آئے، تھوڑی دیر میں گاؤں آگ میں جل رہا تھا۔جن لوگوں نے

آپ کی بات پر یقین کیا تھا وہ محفوظ رہے اور جنہوں نے توجہ نہ دی تھی آگ کا شکار ہوئے۔ حضرت کے ایک مرید مولانا چندن ایک دن کپڑے دھونے تالاب پر گئے۔ وہاں ایک حسین عورت کو دیکھ کر اس پر شیفتہ ہو گئے۔ حسینہ کی رضامندی سے دست درازی کی ترغیب ملی۔ اس سے پہلے کہ وہ نفس کی ترغیب میں مزید آگے بڑھتے انہوں نے دیکھا کہ انکے مرشد ہاتھ میں عصا لئے سامنے کھڑے ہیں۔ مولانا چندن خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹ گئے اور وہاں سے بھاگ کر شیخ کی خانقاہ میں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت عبادت میں مشغول ہیں۔ آہٹ پاکر انہوں نے آنکھ کھولی، فرمایا ''ڈرنے کی ضرورت نہیں' پیر محافظ وقت ہوتے ہیں''۔

الکھ داس بن کر اسلام کی تبلیغ کی

جس زمانہ میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کی روحانی اور علمی رفعتوں کے چراغ جل رہے تھے، وہ بھکتی تحریک کے عروج کا دور تھا۔ کبیر کی اودھی بھاشا میں کی گئی انقلابی شاعری نے پورے ہندوستان کو متاثر کر دیا تھا۔ پنجاب میں بابا گرونانک ہندو معاشرے کو بھکتی اور نجات کا راستہ دکھانے کیلئے اپنی موثر پنجابی شاعری کو وسیلہ بنا رہے تھے۔ اس عظیم مقصد کے لئے انہوں نے تمام صوفیائے کرام اور سادھو سنتوں کا عارفانہ اور ناصحانہ کلام جمع کر کے عظیم گروگرنتھ صاحب کی تدوین کی تھی۔ اسی عہد میں حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے الکھ داس کے روپ میں عرفان وآگہی کے چراغ روشن کئے۔ الکھداس بن کر انہوں نے دو متضاد تہذیبوں کو قریب لانے کی تاریخ ساز کوشش کی۔ اودھی بھاشا میں ان کی شاعری نہ صرف اخلاقی وروحانی تعلیم عام ہندوستانیوں تک پہنچانے کی کوشش ہے۔ بلکہ ایک ولی کامل اور عالم شریعت وطریقت ہوتے ہوئے بھی الکھ داس خلص اختیار کرنے میں اپنے وطن ہندوستان

سے محبت اور یہاں کے ہندو مسلم عوام کی تہذیبی اور سماجی ہم آہنگی سے ایک صحت مند ہندوستانی سماج کی تعمیر کا جذبہ کارفرما تھا۔ انہوں نے اسی کام کو آگے بڑھایا جو بھکتی تحریک کے سادھو سنتوں نے شروع کیا تھا۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے الکھ داس کے طور پر مشترکہ تہذیب کے خط وخال سنوارنے میں اس دور کے ہندو بزرگوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے جوگیوں اور سنتوں کی طرح راگ راگنیوں کے مطابق اشعار کہے۔ انکا ہندی کلام اسی صوفیانہ طرز کا ہے جو کبیر بانی اور گروگرنتھ صاحب میں ملتا ہے اور گجرات کے صوفی شعراء شیخ باجنؒ، قاضی محمود، دریائی اور شاہ جیو گام دھنی اور دکن میں جگت گرو (ابراہیم عادل شاہ ثانی) کی کتاب 'نورس' میراں جی شمس العشاق، برہان الدین جام اور امین الدین عالی تک نظر آتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اپنے قبل وبعد کی صوفیانہ شاعری کے اہم ستون ہیں آپ کی مشہور کتاب 'رشد نامہ، اودھی بھاشا میں تصوف ومعرفت کا خزانہ اور دو تہذیبوں کے اتحاد وامتزاج کا آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ جگ ناہیں باج پی، بوجھ برہم گیان
سو پانی، سو بلبلا سوائی سرو و رجان

(یہ زمانہ دنیاوی جھمیلوں سے دور رہنے کا ہے، تجھے برہم گیان (حقیقت الٰہیہ) کا عرفان حاصل کرنا چاہئے، پانی کے قطرے اور بلبلے میں سچائی کا تالاب پوشیدہ ہے)

الکھ داس جی کس طرح ہندوستان کے باسیوں کو ذہنی اتحاد کے رشتے میں باندھ کر سکون وآشتی کا سبق دے رہے ہیں:

ایکے ادہو، ایکے ماس، ایکے سرور، ایکے ہانس
گورمکھ بوجھ برہم گیان تیں ترلوک ایکے جان

(وہ (خالق) ایک ہی ہے، ایک ہی گوشت پوست سے سب بنے ہیں، سب کا مالک ایک ہی ہے، گورمکھ (مرشد) سے خدا کے بارے میں جانو، اور جان لو کہ (ترلوک) زمین، آسمان اور پاتال کا وہی خدا مالک ہے)۔

جدھر دیکھوں سکھی دیکھوں ہور نہ کوئے
دیکھا بوجھ بچاریں سبھی آپیں سوئے

(اے سہیلی (لوگو!) جدھر دیکھتا ہوں اس کے (خالق کائنات کے) سوائے کچھ نظر نہیں آتا، جتنا غور کروگے اسے اپنا پاس پاؤگے) حضرت گنگوہیؒ کس طرح فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کا ماحول تیار کرتے ہیں:

صدق، رہبر، صبر، توشہ، دشت، منزل، دل، رفیق
ستیہ نگری، دھرم، راجا، جوگ مارگ

(یعنی صدق اور راستی ایک شہر ہے، نیک اعمال، بہتر حکمراں اور زہد وتقویٰ (ترکِ دنیا) ہی منزل نجات تک پہنچنے کا راستہ ہے)

ہندی بھاشا کے مہا گیانی الکھ داس جی کی یہ کویتا دیکھئے:

دھن کارن پی آپ سنوارا
بن دھن سنگھی کنت کنہارا
شبہہ کھیلے دھن ماہیں ایواں
باس پھول اچھے حیواں
کیوں نہ کھیلوں تجھ سنگ میتا
مجھ کارن تیں ایتا کیتا
الکھ داس آکھے سن سوئی
سوئی پاک ارتھ پھن سوائی

مال ودولت سے خود کو بڑا اور اچھا بنایا، لیکن جب دولت باقی نہ رہی تو ساتھی سنگی سب نے کنارہ کرلیا۔ بادشاہ اپنے محلوں میں مال وزر سے کھیلتے ہیں لیکن غریب جاندار پھولوں کی خوشبو سے مست رہتے ہیں۔ میں کیوں نہ تجھ سے محبت کروں، جس نے 'خدا' نے مجھے ہر طرح سے نوازا، الکھ داس کی بات سنو، اس 'قدرت' کے مفہوم کو سمجھو۔

آپ گنوویں پی لے، پی کھوئے سب جائے
اکتھ کھتا ہے پریم کی جے کوئی بوجھے مائے

(اپنی ہستی کو فنا کردینے سے ہی محبوب (خدا) کا قرب حاصل ہوتا ہے، اگر محبوب کھو جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا۔ محبت ایک ان کہی پہیلی ہے اگر کوئی جاننا چاہتا ہے تو مجھے سمجھ لے۔ سنت کوی الکھ داس کے روپ میں حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے بھارت کی سنت پرمپرا کے مطابق خوبصورت اور دلپذیر انداز میں عشق الٰہی اور سلوک ومعرفت کی تعلیم دی ہے۔ ان کے کلام میں وحدۃ الوجود کی جلوہ نمائی پوری طرح اجاگر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

جگ مایا چھوڑ کر ہوں تج جوگن ہوں
باج پیاری ہے سکھی ایکو جگ نہ لیئوں

(دنیائے فانی کی نیرنگیوں کو چھوڑ کر تیرا جوگی (خدا کا طلب گار) بن گیا ہوں، اے سکھی! (لوگو!) اب تو اگر مجھے یہ ساری دنیا بھی دی جائے تو ہرگز قبول نہ کروں، یعنی جسے اللہ تعالیٰ کی رضا مل جائے اس کے لئے دنیا کی کیا حقیقت ہے۔

شیخ عبدالقدوسؒ کی کتابیں

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اپنے عہد کے سنتوں اور صوفی شاعروں میں اسلئے انفرادی شان کے مالک ہیں کیونکہ وہ فارسی کے زبردست عالم، دانشور اور شاعر

بھی تھے۔انہوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں 'انوارالعیون'، 'رسالہ قرۃ لعین'، 'رشد نامہ'، 'غرائب الفوائد'، 'مظہر العجائب'، 'مکتوبات قدسیہ' مشہور ہیں۔آپکے ایک مرید مولانا خصر بدھن بن رکن جونپوری نے آپکے مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کیا جس میں انکے مریدوں اور احباب کو لکھے گئے اور ان خطوط میں پند ونصائح کا ایک جہان آباد ہے۔فارسی میں آپ کی غزلیہ شاعری تصوف ومعرفت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔آپکی ایک مشہور غزل کے یہ اشعار دیکھئے:

آستین بررخ کشیدہ ہم جو مکار آمدی
باخودی خود در تماشا سوئے بازار آمدی
شورِ منصور از کجا ودارِ منصور از کجا
خود زدی بانگِ انا الحق برسرِ دار آمدی
گفت قدوسؔ فقیرے در فنا و در بقاء
خود زخود ازاد بودی خود گرفتار آمدی

اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کا راستہ

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کا ذکر کرتے ہوئے صاحب 'اخبارالاخیار' لکھتے ہیں: ''شیخ عبدالقدوس نے اپنے رسالہ قدسیہ میں بھوک کے بیان میں لکھا ہے کہ بھوک کی دو قسمیں ہیں: سفلی اور علوی۔سفلی بھوک تمام حیوانات میں ہے۔حیوانی روح جب اس دنیا میں جانوروں کے اندر آکر انکے جسم کو واضح کرتی ہے یعنی جب جانور چلنے پھرنے لگتے ہیں، ان میں حرارت بھی پیدا ہوچکتی ہے تو وہ غذا کے محتاج نظر آتے ہیں اور ان کو بھوک پیاس کے ادنیٰ درجے (سفلی) کی وجہ سے ترقی نہیں کرسکتے، تمام حیوانات اسی سفلی بھوک سے متصف ہیں جب کہ علوی بھوک تمام

انسانوں میں موجود ہے۔انسان جب عالم غیب سے عالم محبوبیت میں ترقی کرتا ہے اس وقت حق کی حقانیت میں ترقی کرتا ہے اس وقت حق کی حقانیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ میدان حضرت الٰہی میں تجلی افروزی کی جانب لپکتا ہے جس کا مطلب اللہ کی احدیت ہے، جس کے بے شمار انوار واسرار جمال وجلال، کریمی ورحیمی، ستاری وجباری، قدوسی وقہاری، رزاقی وخلاقی، رحمانیت وربوبیت ہزار اور ہزار موج درموج لہریں لیتی ہے۔علوی بھوک کے ذریعے ہی انسان اللہ تک پہنچتا ہے۔یہ صرف بنی نوع انسان کی خصوصیت ہے، دوسرے حیوانات اس سے محروم ہیں کیونکہ وہ سراسر سفلی ہیں۔فرشتے اور روحیں اگرچہ علوی ہیں لیکن بھوک کی آگ سے محروم ہیں۔اسی لئے وہ اپنے مقام سے ذرہ برابر ترقی نہیں کرسکتے۔کیونکہ اپنے مقام سے ہلنا آگ کا کام ہے، یا پھر درد ومحبت اور عشق کا خاصہ ہے۔اچھی طرح سن لو کہ بھوک کے تین درجے ہیں، ایک کو آتش گرسنگی کہتے ہیں جس کی خوراک کھانا وپانی ہے، دوسرے کو آتش درد ومحبت وعشق کہتے ہیں جس کی غذا حسن وجمال اور اوصاف کمال ہے، جیسا کہ ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَال:

عاشق حسنِ خود است آں بے نظیر
حسنِ خود را خود تماشا کند

(وہ بے مثال وبے نظیر اللہ خود ہی اپنے حسن کا عاشق ہے اور اپنے حسن کا خود ہی تماشا کرتا ہے)

شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ کے پیر ومرشد

اپنی گرانقدر کتاب 'انوارالعیون' میں حضرت گنگوہیؒ نے اپنے روحانی مرشد حضرت شیخ عبدالحقؒ کے فضائل ومناقب بڑی عقیدت اور علمی بصیرت کے ساتھ بیان

کئے ہیں۔حضرت احمد عبدالحق ردولویؒ، شیخ جلال الدین پانی پتیؒ کے مرید اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔روایت ہے کہ حضرت احمد عبدالحقؒ سات برس کے تھے، ان کی والدہ تہجد کی نماز کے لئے بیدار ہوا کرتی تھیں تو وہ بھی ان کے ساتھ اٹھتے اور تہجد کی نماز پڑھتے۔ان کی ماں نے بچے کو جلد بیدار ہونے سے منع کیا تو کہا ''امی، تم راہزن ہو، کیونکہ مجھے اللہ کی عبادت سے روکتی ہو'' آپ کے بڑے بھائی تقی الدین نے انہیں دنیوی تعلیم دلانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہے کیونکہ احمد کا دل پڑھنے کی طرف تھا ہی نہیں۔بارہ سال کی عمر میں ہی گھر سے نکل پڑے۔اس عہد کے برگزیدہ اہل اللہ کے فیضان نے انہیں ولی کامل بنا دیا۔حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے یہ روایت خاص طور پر درج کی ہے کہ شیخ عبدالحق نے جامع مسجد میں چالیس برس تک جاروب کشی کی خدمت انجام دی لیکن مسجد کا راستہ نہ پہچان سکے۔مسجد جاتے وقت آپ کے ساتھ ارادت مندوں کا ایک ہجوم ہوتا تھا جو حق حق کہتے جاتے تھے۔جدھر وہ چلتے آپ بھی ان کے ساتھ چلتے رہتے۔عشق الٰہی کی مستی میں ان کی آنکھیں بند رہتی تھیں۔آپ اور آپ کے مرید حق حق کا ذکر بہت کیا کرتے تھے اس لئے ان کے سلسلے سے منسلک لوگ السلام علیکم کی جگہ ''حق حق'' کہتے تھے۔چھینک آنے پر بھی ''حق حق'' کہنے لگے تھے۔خط و کتابت کرتے وقت خط کے اوپر تین بار حق لکھتے تھے۔لیکن آپ نے خلاف سنت ہونے کی وجہ سے خود ہی اس کی ممانعت فرمادی تاہم خطوط کے سرنامے پر لفظ حق لکھنے کی اجازت برقرار رکھی۔حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت احمد عبدالحق ردولویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ذاتِ باری تعالیٰ بے نشان ہے، اگر اس ذات پاک کا کوئی اسم مقرر کیا جاسکتا ہے تو وہ ''حق'' سے بہتر کوئی نام نہیں اس لئے کہ حق کے معنی وہ ذات ہے جس کے اندر تمام کمالات پائے جاتے ہیں اور وہ ذات ثابت بالذات ہو۔اس اعتبار سے اسم حق کا اطلاع خدائے تعالیٰ کی ذات پر

بطریق کمال ہوگا۔''انوار العیون'' میں حضرت گنگوہیؒ نے تحریر کیا ہے کہ آپ کے اکثر مریدوں کے انتقال کے وقت یہ حالت ہوتی تھی کہ ان کی زبان پر لفظ حق جاری ہوتا تھا۔اسی طرح آپ کی خانقاہ میں غیب سے لوگوں نے لفظ حق کی آواز کو سنا۔خود شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے ان کے مزار میں جاروب کشی کرتے ہوئے یہ آواز سنی اور ان کی زندگی روحانی انقلاب سے ہمکنار ہوگئی۔

بابر کی حضرت قطب عالم سے ملاقات

حضرت گنگوہیؒ الکھ داس کا زمانہ بھکتی کال کا زمانہ ہے۔بابا گرونانک اور حضرتؒ کا انتقال ایک ہی سنہ میں ہوا۔یہ دور سلطان سکندر لودھی اور اس کے بعد بابر کے ہندوستان فتح کر لینے کا ہے۔سکندر لودھی ہندوستان کا وہ پہلا حکمراں تھا جس کے عہد میں ہندوؤں نے باقاعدہ فارسی کی تعلیم حاصل کرتے اور بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر تعینات کیے جاتے تھے۔جس وقت بابر ہندوستان کا بادشاہ بنا اس نے یہاں کے علماء مشائخ، صوفیا اور سادھو سنتوں کا احترام کیا اور ان سے ملاقاتیں کیں۔بابا گرونانک نے بابر کو سات پشتوں تک حکومت کے استحکام کی دعا دی تھی۔بابر نے حضرت گنگوہیؒ الکھ داس سے بھی ملاقات کی تھی جس کی تصدیق محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے:

''اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ سکندر لودھی مذہبی معاملات میں تنگ نظر اور متعصب تھا اور دوسری حیثیتوں سے اس کی کامیاب حکومت غیر مسلموں کے ساتھ اپنے متعصّبانہ رویے کی بنا پر داغدار تھی، اپنی ابتدائی عمر میں جب وہ ایک شہزادہ تھا، مولانا عبداللہ اجودھنی سے برہم ہوگیا تھا جنہوں نے تھانیسر کے ہندوؤں کی ایک مذہبی رسم میں اس کی دخل اندازی پر اعتراض کیا تھا اور کہا تھا کہ اسلام اس طرح کی

دخل کی اجازت نہیں دیتا،لیکن جب سکندر تخت پر بیٹھا تو اس کا بت شکنی کا جذبہ نگرکوٹ کے مندر کے بتوں کو تباہ کردینے کے ذریعہ ظاہر ہوا، اس نے بتوں کو قصائیوں کو گوشت تولنے کے باٹ کے طور پر دے دیا۔اس مذہبی پالیسی کے اتباع کے سلسلے میں اس کی منشا کا اندازہ کرتے وقت کوئی اس حقیقت کونظر انداز نہیں کرسکتا کہ روایت تو اسے جونپور کے شرقی حکمرانوں کی عمارتوں کو بھی برباد کرنے کا ذمہ دار بناتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ اس کے عہد میں ہندوؤں نے فارسی سیکھنا شروع کیا اورانہیں بڑی تعداد میں مختلف عہدوں پر فائز کیا گیا۔اس حقیقت کی جانب شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے بابر کی توجہ مبذول کی‘‘۔

☆☆☆

شیخ ابوسعید گنگوہیؒ[۲]

حضرت شیخ ابوسعید گنگوہیؒ جوحضرت شیخ عبدالقدوس قطب عالم گنگوہیؒ کے پوتے تھے۔حالات نے آپ کو برگشتہ بنادیا تھا۔اورایک طوائف پر عاشق ہوگئے۔ ایک رات زبردست طوفان آندھی اورشدید بارش تھی۔آسمان پر بجلی کی چمک اور بادل گرج رہے تھے۔کہ آپ کواس طوائف کی یاد نے بے چین کردیا۔اسی وقت گھر سے نکل کرطوائف کے مکان پر پہونچے لیکن موسم خراب ہونے کی وجہ دروازہ بند تھا۔ آپ نے دیکھا کہ مکان کی چھت سے ایک موٹی رسی لٹکی ہوئی ہے۔آپ نے اس کو پکڑااوراوپر چڑھ گئے اورچھت سے سیڑھیوں کے ذریعہ نیچے چلے گئے تو طوائف نے حیران ہوکرکہا آپ اندر کیسے آگئے؟ کہا:

جورسی تم نے لٹکارکھی ہےاس کو پکڑکرچھت پر چڑھ کرآ گیا ہوں۔طوائف نے منع کیا، میں نے تو کوئی رسی نہیں لٹکارکھی ہے، ذرا مجھے بھی بتاؤ کہ وہ رسی کہاں ہے؟ دونوں چھت پر گئے اورلٹکی ہوئی رسی تک پہنچے تو دیکھا کہ وہ رسی نہیں بلکہ ایک لمبا سانپ ہے جوچھت سے لے کرزمین تک لٹکا ہوا ہے۔دونوں یہ دیکھ کر حیران وپریشان ہوکرنیچے آگئے۔

۲ انوارالسالکین مولف محمدادریس حبان رحیمی،مطبوعہ ادارہ اشاعت اسلام دیوبند

طوائف کی باتوں کا دل پر اثر

طوائف نے گفتگو کے درمیان کہا کہ آپ کا ایک عورت کے ساتھ عشق اس انتہا کو پہنچ چکا ہے کہ عشق میں ایسے مغلوب ہوئے کہ سانپ بھی رسی نظر آیا۔ کاش کہ آپ کو ایسا عشق اللہ تعالی سے ہوتا تو آپ کا مقام کتنا اونچا ہوتا۔ اور اللہ تعالی کے حضور کیسی مقبولیت ملتی۔ اس نے کہا آپ اپنے آباء واجداد کے مقام اور ان کی بزرگی اور خدا ترسی کو بھی دیکھو۔ اور اپنے آپ کو دیکھو کہ وہ کیسے مقبولِ خدا اور رسول تھے۔ اور ایک آپ ہیں کہ خواہشاتِ نفس نے آپ کو غلام بنا کر گمراہ کر دیا ہے۔

طوائف کی باتوں کا شیخ ابوسعید کے دل پر نہایت اثر ہوا۔ اور پھر آپ نے دل سے توبہ کی اور اپنے آپکو سدھارنے اور بنانے کے لئے بلخ جانے کا ارادہ کرلیا۔ تا کہ اپنے دادا جان شیخ عبدالقدوس قطب عالم گنگوہیؒ کے نقش قدم پر چل کر اولیاء اللہ میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ ایک روز سامان سفر تیار کیا اور بغرض بیعت شاہ نظام الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بلخ تشریف لے گئے۔ شاہ نظام الدینؒ کو اطلاع ہوئی کہ صاحبزادہ تشریف لاتے ہیں تو ایک منزل پر آ کر استقبال کیا۔ اور خوب خوب خاطر کیں۔ ہر روز نئے نئے اور لذیذ سے لذیذ کھانے پکوا کر کھلاتے۔ ان کو مسند پر بٹھاتے تو خود خادموں کی جگہ بیٹھتے۔ آخر جب شاہ ابوسعیدؒ نے اجازت چاہی کہ وطن واپس ہوں تو شاہ نظام الدینؒ نے بہت سی اشرفیاں بطورِ نظرانہ پیش کیں، اس وقت شاہ ابوسعید نے عرض کیا کہ حضرت اس دنیاوی دولت کی مجھے ضرورت نہیں نہ اس کے لئے میں یہاں آیا۔ مجھے تو وہ دولت چاہئے جو آپ ہمارے یہاں سے لیکر آئے ہیں۔ بس اتنا سننا تھا کہ شاہ نظام الدینؒ آنکھ بدل گئے اور جھڑک کر فرمایا کہ جاؤ طویلہ میں جا کر بیٹھو اور کتوں کے دانہ راتب کی خبر رکھو۔ غرض یہ طویلہ میں آئے۔

شکاری کتے ان کی تحویل میں دیئے گئے کہ روز نہلائیں دھلائیں اور صاف ستھرا رکھیں کبھی حمام جھکوایا جاتا اور کبھی شکار کے وقت شیخ گھوڑے پر سوار ہوتے اور یہ کتوں کی زنجیر تھام کر ہمراہ چلتے۔ آدمی سے کہدیا گیا یہ شخص جو طویلہ میں رہتا اس کو دو روٹیاں جو کی دونوں وقت گھر سے لا دیا کرو۔

شیخ ابوسعید کا مجاہدہ

اب شاہ ابوسعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کبھی حاضر خدمت ہوتے تو شیخ نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ چماروں کی طرح دور بیٹھنے کا حکم فرماتے اور التفات بھی نہ فرماتے تھے کہ کون آیا اور کہاں بیٹھا۔ تین چار ماہ بعد ایک روز حضرت شیخ نے بھنگن کو حکم دیا کہ آج طویلہ کی لید اکٹھی کر کے لے جائے تو اس دیوانہ کے پاس سے گذر یو جو طویلہ میں بیٹھا رہتا ہے۔ چنانچہ شیخ کے ارشاد کے بموجب بھنگن نے ایسا ہی کیا، پاس سے گذری کچھ نجاست شاہ ابوسعیدؒ پر پڑی۔ شاہ ابوسعیدؒ کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا تیوری چڑھا کر بولے، ''نہ ہوا گنگوہ ورنہ اچھی طرح مزہ چکھاتا۔ غیر ملک ہے شیخ کے گھر کی بھنگن ہے اس لئے کچھ نہیں کر سکتا''۔ بھنگن نے قصہ حضرت شیخؒ سے عرض کر دیا۔ حضرت نے فرمایا ہاں ابھی بو ہے صاحبزادگی کی۔ پھر دو ماہ تک خبر نہ لی۔ اس کے بعد بھنگن کو حکم ہوا آج پھر ویسا ہی کرے بلکہ قصداً کچھ غلاظت شاہ ابوسعید پر ڈال کر جواب سنے کیا ملتا ہے۔

چنانچہ بھنگن نے پھر ارشاد کی تعمیل کی۔ اس مرتبہ شاہ ابوسعید نے کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ ہاں تیز اور ترچھی نگاہ سے دیکھا۔ اور گردن جھکا کر خاموش ہو رہے بھنگن نے آ کر حضرت شیخ سے عرض کیا کہ آج تو میاں کچھ بولے نہیں، تیز نظروں سے دیکھ کر چپ ہو رہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا ابھی کچھ بو باقی ہے۔ پھر دو چار ماہ

کے بعد بھنگن کو حکم دیا کہ ''اس مرتبہ لید گوبر کا بھرا ٹوکرا اس پر ڈال ہی دینا کہ پاؤں تک بھر جائیں'' چنانچہ بھنگن نے ایسا ہی کیا مگر اب شاہ ابوسعیدؒ بن چکے تھے جو کچھ بننا تھا۔اس لئے گھبرا گئے اور گڑگڑا کر کہنے لگے ''مجھ سے ٹھوکر کھا کر بیچاری گر گئی، کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔؟'' یہ فرما کر گری ہوئی لید جلدی جلدی اٹھا کر ٹوکرے میں ڈالنی شروع کی کہ لاؤ میں بھر دوں۔بھنگن نے قصہ حضرت شیخ سے آ کر کہا کہ آج تو میاں جی غصہ کی جگہ الٹے مجھ پر ترس کھانے لگے اور لید بھر کر میرے ٹوکرے میں ڈال دی۔ شیخ نے فرمایا ''بس اب کام ہو گیا''۔

شیخ نظام الدین نے شیخ عبدالقدوسؒ کو خواب میں دیکھا

اسی دن شیخ نے خادم کو زبانی کہلا بھیجا کہ آج شکار کو چلیں گے۔کتوں کو تیار کر کے ہمراہ چلنا، شام کو شیخ گھوڑے پر سوار خدام کا مجمع ساتھ جنگل کی طرف چلے۔شاہ ابوسعیدؒ کتوں کی زنجیر تھامے پا برکاب ہمراہ ہو لئے۔کتے تھے زبردست شکاری کھاتے پیتے توانا اور ابوسعید بے چارے سوکھے بدن کمزور اس لئے کتے ان کے سنبھالے سنبھلتے نہ تھے۔بہتیرا کھینچتے روکتے مگر وہ قابو سے باہر ہوتے جاتے تھے آخر انہوں نے زنجیر کمر سے باندھ لی شکار جو نظر پڑا تو کتے اس پر لپکے۔اب شاہ ابوسعیدؒ بے چارے گر گئے اور زمین پر گھسٹتے کتے ان کو کھینچتے کھینچتے چلے جاتے تھے۔کہیں اینٹ لگی کہیں کنکر چبھی بدن سارا لہولہان ہو گیا۔مگر انہوں نے اف نہ کی جب دوسرے خادم نے کتوں کو روکا اور ان کو اٹھایا تو تھر تھر کانپنے لگے کہ حضرت خفا ہوں گے اور فرمائیں گے کہ حکم کی تعمیل نہ کی، کتوں کو روکا کیوں نہیں؟ شیخ کو تو امتحان مقصود تھا۔سو ہو لیا۔اسی شب شیخ نے اپنے مرشد قطب العالم شیخ عبدالقدوسؒ کو خواب میں دیکھا کہ رنج کے ساتھ فرماتے ہیں ''نظام الدینؒ میں نے تجھ سے اتنی کڑی محنت نہ لی تھی جتنی تو نے

میری اولاد سے لی'' صبح ہوتے ہی شاہ نظام الدینؒ نے شاہ ابوسعیدؒ کو طویلہ سے بلا کر غسل کرایا۔تیار جوڑا پہننے کے لئے عطا فرمایا۔خوشبو لگائی اور بار بار سینے سے لگایا۔ پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا۔خاندانِ چشتیہ کا فیضان میں ہندوستان سے لے کر آیا تھا وہ میں آپ کو عطا کر کے اور مجاز حقیقت بنا کر ہندوستان واپس کر رہا ہوں۔اور فرمایا ابوسعیدؒ ذرا سامنے والے پہاڑ پر دیکھو آپ نے نظر بھر کر دیکھا تو آگ لگ گئی۔فرمایا آپ کو نسبتِ جلالی بھی حاصل ہے آنکھوں پر پٹی باندھ دی راستہ کے لئے خدام کو ساتھ کر دیا اور فرمایا گنگوہ پہنچ کر سب سے پہلے حضرت شیخ قطبِ عالم کے مرقد مبارک پر حاضری دینا اور وہیں اس پٹی کو کھولنا تا کہ نسبتِ جلالی نسبتِ جمالی میں بدل جائے۔ ورنہ جہاں دیکھو گے آگ کا ظہور ہوگا۔غرض آپ خرقہ خلافت لے کر گنگوہ پہونچے۔

یہ واقعہ اگرچہ کتبِ تواریخ میں بھی ہے اور سوانح حضرت گنگوہیؒ تذکرۃ الرشید اور ارواحِ ثلاثہ میں بھی حضرت تھانویؒ کی روایت سے نقل کیا ہے لیکن ان تمام سے زیادہ مفصل میرے پیر و مرشد حضرت مولانا الحاج مصطفٰے کامل صاحب رشیدی اعرابیؒ (نبیرہ حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) نے سنایا تھا۔اس کو من وعن نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔اللہ تعالی ہم سیاہ کاروں کو بھی ان حضرات کی جوتیوں میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی صفوں میں شامل فرمائے۔آمین!

☆☆☆

امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ [۳]

حضرت امامِ ربانی مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ نے ۶ ر ذیقعدہ ۱۲۴۴ھ ہجری نبوی کو بیوم دوشنبہ چاشت کے وقت اس گہوارہ عالمِ فانی میں قدم رکھا۔ یعنی قصبۂ گنگوہ ضلع سہارنپور محلّہ سرائے میں خانقاہ شیخ المشائخ مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ کے متصل اس جدّی مکان میں آپ کی ولادت شریفہ ہوئی جو درگاہ حضرت شیخ کے شرقی سمت میں تخمیناً پچیس تیس قدم کے فاصلہ پر واقع ہوا اور اب تک قائم ہے گویا دو شنبہ کی ولادت میں غیر اختیاری سنت نبویہ کا شرف حاصل فرما کر بے خبر کانوں میں یہ مژدہ پہونچایا کہ اے بطحائی پیغمبر کی طرز معاشرت و تحصیل معاد سے غافل ہو جانے والو ہوشیار ہو جاؤ ''خواب غفلت سے جاگو'' اور اس تعلیم صادق کے امیدوار و منتظر رہو جو مردہ سنتوں کی احیاء اور متروکہ طریق نبویہ کے رائج و نافذ ہونے کے متعلق خالق جل وعلی شانہ کو میرے ہاتھوں لینی اور مجھے نائب رسول بنا کر متنبہ کر دینے والا محی سنت محمدیہ قرار دینا ہے حضرت رحمۃ اللہ علیہ ماں اور باپ دونوں سلسلوں سے شریف النسب یعنی نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ایوبی النسل تھے چنانچہ باپ کی جانب سے خاندانی سلسلہ جس کو حضرت نے خود بیان فرمایا تھا اس طرح ہے۔

۳ ماخوذ: فیضان گنگوہی مولف محمد ادریس حبان رحیمی، مطبوعہ رحیمی کتب خانہ بنگلور

''مولانا رشید احمد بن مولانا ہدایت احمد صاحب بن قاضی پیر بخش بن قاضی غلام حسن بن قاضی غلام علی بن قاضی علی اکبر بن قاضی محمد اسلم الانصاری الایوبی رحمۃ اللہ علیہ''۔

اور ماں کی جانب سے سلسلہ نسب جس کو حضرت کے ماموں محمد شفیع صاحب نے خاندانی شجرہ محفوظہ سے نقل کرایا۔ یوں ہے مولانا رشید احمد صاحب بن مسماۃ کریم النساء بنت فرید بخش بن غلام قادر بن محمد صالح بن غلام محمد بن فتح محمد بن تقی محمد بن صالح محمد بن قاضی محمد کبیر الانصاری بن قاضی امن الدین عرف قاضی امن بن خواجہ فرید بن خواجہ شاہ بن خواجہ محمد فاضل بن خواجہ ہاشم بن خواجہ علاؤ الدین بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ نجم الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ بڈا بن خواجہ عبدالمجید بن خواجہ کبیر بن خواجہ رکن الدین بن خواجہ شرف الدین بن خواجہ تاج الدین بن خواجہ منہاج الدین بن خواجہ ہاشم بزرگ بن اسمعیل بن خواجہ عبداللہ ہراتی بن خواجہ ابومحمد منصور بن خواجہ علی بن خواجہ محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ جعفر بن ابی منصور بن ایوب بن الشیخ ابوایوب الانصاری کہ اصل نام پاک آں صحابی رسول مقبول ﷺ خالد بود۔

حضرتؒ کا نسبی سلسلہ جدہ کی طرف سے گیارہویں پشت پر حضرت امامِ ربانی غوث صمدانی قطب العالم شیخ المشائخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے جا ملا ہے اسلئے کہ حضرت کے جد بزرگوار یعنی جناب قاضی پیر بخش مرحوم کی والدہ ماجدہ شیخ محمد صلاح کی صاحبزادی تھیں جن کا نام مسماۃ بولی تھا اور شیخ محمد صلاح کے جد سابع حضرت شیخ الشیوخ عبدالقدوس گنگوہی ہیں چنانچہ سلسلہ اس طرح ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب بن مولانا ہدایت احمد بن قاضی پیر بخش بن مسماۃ بولی بنت محمد صلاح بن محمد صالح بن الشیخ عبدالاحد بن محمد طاہر بن فتح اللہ بن عبدالصمد بن عبدالحمید بن الشیخ الامام الہمام الاکمل عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

امام ربانی کا سلسلہ نسب

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے آباؤ اجداد یعنی سلسلہ نسب سے معلوم ہونے والی پاک اصلاب کا جدا جدا تذکرہ معلوم ہونا گو چنداں دشوار نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ اصل مقصد یعنی سوانح رشیدی سے بُعد ہو جائیگا اسلئے چھوڑا جاتا ہے ہاں اس مقدس تذکرہ کو وضاحت کیلئے جن مبادی کی ضرورت ہے انکا ذکر چونکہ لازمی ہے اسلئے سب سے اول یہ جتلا دینا ضروری ہے کہ حضرت مولانا کے شریف النسب اور نجیب الطرفین ہونے کیلئے بلکہ محبت وعظمت رسالت مآب ﷺ کا وارث بننے کے لئے یہ جلالت نسبی کافی ہے کہ آپ کے جدامجد حضرت مولانا ابوایوب مدنی انصاری صحابی رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مہاجر ماہتاب رسالت کو مدینہ منورہ میں اپنے مبارک مکان کے اندر جگہ دی اور اس نعمت خداوندی کے بھرپور خزانہ کی تقسیم کا شرف اپنے میموں منزل کے دامنوں میں حاصل کیا جس کو اہل مکہ نے ناقدردان بنکر اپنے سے علیحدہ کیا تھا اس جاں نثار میزبان رسول کے شیریں تذکرہ اور لذت والے نام سے کون مسلمان ہے جو ناواقف ہو اور اس خوش نصیب حامی وناصر دین شیخ کی قابل فخر عزت اور تا قیامت مشہور رہنے والی خدمت سے کونسا کان ہے جو آشنا نہیں۔

مبارک منزلے کان خانہ راما ہے چنین باشد
ہمایوں کشورے کان عرصہ راشا ہے چنین باشد

اس لازوال دینی دولت سے مالا مال ہونے والے اور سلطان دین کی اَن گِنت بخششوں سے گودیں بھرنے والے صحابی کی نسل میں اگر ایسے درفرید اور بے بہا لعل پیدا ہوں جو ضعف ایمانی کے وقت سب سے پہلے اپنے قدم بڑھا دیں اور تلف ہونے والی دینی نعمتوں سے گود بھریں مردہ سنتوں کو زندہ کریں، اور غفلت کی نیند

سوئے ہوؤں کو جگائیں تو تعجب ہی کیا ہے اخر سلطانی میزبانی کا صلہ وانعام اور سلطان دین کے قدموں کی برت کا اثر کچھ تو قیامت تک ضرور قائم رہے اور وہ یہی ہے کہ جس گلاب کے تختہ پر سلطانی تخت اول جلوہ افروز ہوا وہ قیامت کے لئے سدا بہار بن گیا اور کبھی نہ کبھی آخری زمانہ کو پہلی بہار کی جھلک دکھلانے کے لئے ضرور قابل حیرت روش پر پھلا اور پھولا، کھلا اور مہکا۔

شیخ عبدالقدوسؒ کی اولاد میں امام ربانی

ادھر دسویں صدی میں عالم کے دماغ معطر کرنیوالا شاداب پھول، یعنی شیخ عبد القدوس قدس سرہٗ کا وجود باجود ارض ہندوستان کے لئے مایۂ ناز اور نسل نعمانی و ذریت بوحنیفہ کوفی میں وہ آفتاب ہدایت تھا جس نے دنیا میں چھائی ہوئی ظلمت وتاریکی پر نور عرفان وضیاء القرآن کی چمکدار شعاعیں ڈالیں اور دل آویز مہک سے عالم کے دل موہ لئے۔ پس نسل ایوبی و ذریت نعمانی میں اس خلف الصدق کی ضرورت تھی جو ہر دو اجداد کے ظاہری و باطنی فیضان سے مستفیض اور شریعت وحقیقت کے شمس وقمر کی نورانی شعاعوں سے بہرہ یاب ہو کر گمراہ ہونے والی مخلوق کا ہادی و راہبر قرار پائے اور نیابت رسالت کا حق ادا کرے۔ شیخ عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۳ر جمادی الآخر ۹۴۵ھ کو اس عالم سے جسمانی انقطاع فرمایا اور تیسری صدی کا آخری سال ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اس خاندان ایوبی کا نام باقی رکھنے والے اور قدوسی مسند کی عزت سنبھالنے والے نونہال نے اپنے وجود مسعود سے خانہ عالم معمور اور وہی قصبہ گنگوہ آباد کیا جس میں قدوسی خانقاہ اپنے شیخ کے سچے جانشین کی تلاش میں تین سو برس سے پریشان حال وویران پڑی ہوئی تھی یعنی تیسری صدی کے پورے اختتام پر شیخ عبدالقدوس کے وصال کا سال اور مہینہ اور دن یعنی ۲۳۔ جمادی الآخر ۱۲۴۵ ہجری

کا روز جب آیا ہے تو ہمارے حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ پورے سات ماہ اور سات دن کی عمر پا چکے تھے فالحمدللہ علی احسانہ۔

گنگوہ سکونت اختیار کی

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی داد ہیال دراصل قصبہ رامپور ضلع سہارنپور ہے مگر چونکہ حضرت کے دادا جناب قاضی پیر بخش صاحب مرحوم نے گنگوہ کو وطن بنالیا اسلئے آئندہ نسل کا انتساب گنگوہ کی جانب ہوا اور تبدیل وطن کی وجہ یہ ہوئی کہ جناب قاضی پیر بخش صاحب مرحوم کے ماموں زاد بھائی شاہ قطب علی صاحب مرحوم گنگوہ کے باشندے تھے۔ شاہ صاحب پر بعض بنی اعمام اور کنبہ کی طرف سے مخالفانہ حملے ہوتے رہتے تھے یہاں تک کہ بعض معاملات میں مخالفت وعناد حد کو پہونچ گیا اور اجتماعی قوت سے صرف یورش ہی نہیں بلکہ شاہ قطب علی صاحب کے قتل کے منصوبے اور جان سے مار ڈالنے کی تدابیر سوچی جانے لگیں۔

شاہ صاحب اول تو یہ کہ تنہا سینہ سپر بنے ہوئے مردانہ وار ایذائیں سہتے رہے آخر قتل کے منصوبوں کی خبر نے جب پریشان کر دیا تو شاہ صاحب نے چار طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور سوائے اپنے پھوپی زاد بھائی جناب قاضی پیر بخش صاحب مرحوم یا انہیں کے دیگر رشتہ داروں کے اور کسی کو اپنا نہ پایا چنانچہ اپنی نازک حالت اور معرض خطر میں پڑی ہوئی جان کی مصیبتیں بھائی کو لکھ بھیجیں اور خواہش کی کہ جس طرح ممکن ہو تم معہ دیگر اقارب کے گنگوہ چلے آؤ تاکہ ادھر میر ڈھارس بندھے اور کمر مضبوط ہو اور ادھر مخالفین پر دباؤ پڑے اور ہیبت چھائے۔ یہ رامپوری خاندانِ ایوبی بڑے دل جگرے کے لوگ تھے خصوصاً قاضی پیر بخش صاحب مرحوم تو دلیری و بہادری اور جرأت وشجاعت میں کئی قصبوں کے اندر مشہور تھے گولی لگانے اور تیر چلانے میں

نہایت مشاق تھے آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے مگر نشانہ اندازی کی مشق ومہارت کا یہ عالم تھا کہ محض حرکت محسوس کر کے بلا نظر آئے شکار کی صرف آواز پر گولی چلا دیتے اور ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی تھی چنانچہ ایک مرتبہ درخت پر بیٹھے ہوئے بندر کی آہٹ پا کر بندوق کو سیدھا کر لیا اور لوگوں سے کہا کہ بندر کو بھگاؤ اور درخت کی شاخوں کو ہلاؤ چنانچہ اِدھر حرکت ہوئی اور اُدھر دھم سے بندر زمین پر آ گرا۔

پتوں کی کھڑکھڑاہٹ نے بندر کو جگہ سے حرکت دی ہی تھی کہ اِدھر گولی چلی اور اُدھر نتیجہ ظاہر ہوا۔ غرض قاضی صاحب مرحوم چونکہ انصاری النسل تھے اسلئے اپنے مظلوم بھائی کی نصرت سے باز نہ رہ سکے گو وطن مالوف چھوڑنا پڑا مگر درخواست کا رد کرنا شان مروت واصالت شرافت کے خلاف سمجھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چند دوسرے کنبہ داروں اور خاص اقارب کو ہمراہ لیکر گنگوہ آباد ہوئے اس وقت قاضی صاحب کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی۔ اس نوعمری میں جبکہ عام طور پر یگانہ اور بیگانے میں تمیز بھی دشوار ہے کنبہ کو کنبہ سمجھنا قرابت داری کے حقوق کی نگہداشت، ننہیال کا پاس ولحاظ، معاونت و برادر داری وطن کا ہجران اور ایثار ونفع رسانی، مروت و وفا، شجاعت وعالی حوصلگی وغیرہا خصائل محمودہ کے بیش بہا جواہرات اسی پاک نفس صاحبی اور جدّ بزرگوار، خادم رسول امی کے حاصل کئے ہوئے شمائل تھے جو ودیعۃً یکے بعد دیگرے ارحام واصلاب میں منتقل ہوتے چلے آتے تھے ورنہ کہاں رامپور اور کہاں گنگوہ کیسے ماموں زاد بھائی اور کیسی معاونت جس کو آجکل عام خیالات نے دوسرے کی بلا کا اپنے سر دھرنا اور کسی پھٹی چادر میں پاؤں ڈالنا سمجھ رکھا ہے قاضی پیر بخش صاحب مرحوم اس تقریب سے گنگوہ میں مدعو ہوئے اور یہیں قیام فرمایا شریف تر خاندان میں شادی ہوئی اور یہیں مولوی ہدایت احمد صاحب تولد ہوئے جو حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد تھے۔

مولانا گنگوہی کے والد مولانا ہدایت احمد صاحبؒ

مولانا ہدایت احمد صاحب کا قصبہ گنگوہ جس طرح مولد تھا اسی طرح تربیت کا گہوارا اور نشو ونما کا مسکن و ماوا بھی تھا کیونکہ مولانا مرحوم یہیں رہے سہے یہیں بڑھے اور جوان ہوئے اسی قصبہ میں پھلے پھولے اور یہیں انصاری خاندان میں مولانا محمد نقی صاحب کی ہمشیرہ کے ساتھ شادی ہوئی۔ مولانا محمد نقی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولوی محمد شفیع صاحب مدظلہ کے بڑے بھائی تھے جو ایام غدر میں شہید ہوئے رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مولانا محمد نقی (ا) صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا قدس سرہ کے خسر بھی ہیں اور ماموں بھی کیونکہ آپ کی صاحبزادی بی بی خدیجہ حضرت مولانا قدس سرہٗ سے بیاہی تھیں۔ یہی عفت مآب خاتون جن کو قطب عالم کی زوجیت کا شرف حاصل ہوا صاحبزادگان جناب حکیم مولانا مولوی مسعود احمد صاحب اور مرحوم و مغفور مولانا مولوی محمود احمد صاحب و نیز صاحبزادی صاحبہ صفیہ خاتون سلمہا ربّہا زوجہ محمد ابراہیم صاحب کی والدہ ماجدہ ہیں۔

حضرت مولانا قدس سرہٗ کے والد ماجد مولانا ہدایت احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ میں مقدس عالم اور دینی مقتدا بزرگ تھے اپنے علم پر عامل اور ریاضت کیش صاحبدل شیخ تھے علم ظاہری یعنی شریعت میں علماء اہل خانقاہ خاندان میں حجۃ اللہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف حاصل تھا اور علم باطنی یعنی طریقت میں شاہ غلام علی صاحب مجددی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے توسل و تعلق ارادت قائم تھا چونکہ مولانا مرحوم اپنے شیخ کے مخلص عقیدت منداور منظور نظر مرید تھے اسلئے مولویت و علم شریعت بیضاء کے ساتھ اصلاح نفس اور سلوک و تصوف کے دریائے موّاج کا بھی وافر حصہ لئے ہوئے تھے۔

مولانا ہدایت احمد صاحبؒ پیر و مرشد شاہ غلام علی صاحبؒ

زود نویسی اور خوشخطی میں اس قدر مشاق تھے کہ کتابیں کی کتابیں لکھ ڈالیں اور قلم برداشتہ بھی لکھیں تو ایسی صاف اور خوشخط گویا ہار میں موتی پرودئے چنانچہ مولانا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی متعدد کتابیں اب تک موجود اور قلمی نسخوں میں صاحبزادہ جناب حکیم مسعود احمد صاحب کے صندوق میں رکھی ہوئی ہیں۔ جناب مولوی ہدایت احمد صاحب کو عملیات اور تعویذ گنڈوں سے بھی مناسبت تھی۔ حُب و بغض اور تسخیر وغیرہ اعمال کا فی الجملہ شوق تھا۔ مولوی حبیب الرحمٰن صاحب کا بیان ہے کہ مولانا اپنے شیخ حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے مجاز یعنی خلیفہ طریقت بھی تھے۔ مولانا مرحوم نے ساڑھے پینتیس سال کی عمر میں بماہ جمادی ۱۲۵۲ ہجری بمرض ماشرہ گورکھپور میں انتقال فرمایا۔ جس وقت یہ باپ کا سایۂ عاطفت حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہٗ کے سر سے اٹھا ہے اسوقت حضرت کی عمر صرف سات برس کی تھی اس یتیم نونہال کی پدرانہ پرداخت آپ کے جدامجد (ا) قاضی پیر بخش صاحب کے حوالہ ہوئی مولوی ہدایت احمد صاحب کے دو صاحبزادے اور تھے جن میں ایک حضرت مولانا سے چند سال بڑے اور فارسی کی ابتدائی کتابوں میں حضرت مولانا کے استاذ بھی تھے جن کا نام مولوی عنایت احمد تھا اور دوسرے حضرت مولانا سے چھوٹے جن کا نام سعید احمد تھا انہوں نے والد صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد بعمر نو سال وفات پائی۔ تینوں حقیقی بھائیوں کی دو بہنیں تھیں ان میں ایک بہن حقیقی سب میں بڑی مسماۃ فصیحاً ہیں اور دوسری بہن علاتی تھیں جن کا نام امۃ الحق تھا۔

☆☆☆

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ [۴]

تجدید دین واصلاح کا کام اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں الگ الگ لوگوں سے لیتا رہا ہے۔کوئی زمانہ اس سے خالی نظر نہیں آتا۔دین کے ان تمام شعبوں کا جامع مجدد بھی ہوا اور کسی ایک شعبہ کا خاص مجدد مصلح بھی ہوا تزکیہ واحسان اور حکمت واخلاق کے راستے سے تجدید کا کام بھی برابر ہوتا رہا مگر امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک پر اثر اور اہم ترین شخصیت کے طور پر سامنے آئی۔

حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے جس انداز سے ارشاد وتربیت کا کام انجام دیا آپ کی اصلاحی وتربیتی سرگرمیوں سے ہزاروں انسانوں کو فیض پہنچا کثرت تصانیف میں چودھویں صدی ہجری میں آپ کا کوئی ہمسر نہیں، بلا شبہ آپ اپنے وقت کے مجدد تھے۔سید الطائفہ حضر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی دست حق پرست پر بیعت ہوکر اکتساب فیض کیا اور ان کے عظیم المرتب خلیفہ ہوئے معاصر علماء ومشائخ میں ان کے مرتبہ مقام کے بارے میں حضرت سید ابوالحسن علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مجدد

[۴] ماخوذ: فیضان گنگوہی مولف محمد ادریس حبان رحیمی، مطبوعہ رحیمی کتب خانہ بنگلور

تصوف وسلوک ہیں اور حضرت مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری میں لکھتے ہیں۔معاصر مشائخ اور اہل ارشاد میں حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سب سے معمر اور نامور تھے۔حضرت مولانا عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے بلند الفاظ میں آپ کا تذکرہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ میرے سامنے فرمایا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے مجدد ہیں اور ایک واقعہ سے متاثر ہوکر فرمایا۔حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ میرے بھی شیخ ہیں۔

(سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، ص:۵۰۳)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تبلیغی کام کرنیوالوں کیلئے مشورہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو لوگ تبلیغ وارشاد کا کام انجام دے رہے ہیں ان کو چاہئے کہ کچھ وقت خلوت مع اللہ کا اپنے معمولات کے لئے بھی مقرر کرلیں دوسروں کی نفع رسانی کے ساتھ ساتھ اپنی نگرانی اور اپنی ترقی سے بے فکر نہ ہوں۔اور فرمایا کرتے تھے تلقی موقوف ہے تجلی پر یعنی خلوت مع اللہ ہی کی برکت سے مضامین القاء ہوتے ہیں اور اسکے برعکس نفع رسانی کا انجام اس کو کنوئیں جیسا ہے کہ جس سے ہر وقت پانی نکالا جائے تو اس کنوئیں سے بجائے پانی کے کیچڑ نکلنے لگتا ہے؟

سادگی ایمان کی علامت

سادگی ایمان کامل کی نشانی ہے۔ایمان کامل جب ہی ہوتا ہے جب اللہ اور رسول کی محبت کاملہ دل میں پیدا ہوجائے اور جب محبت کاملہ پیدا ہوگی تو غیر محبوب میں مشغول سے وحشت ہوگی عشق تکلفات کے ساتھ جمع ہوئی نہیں سکتا۔اس وقت ایک عجیب بات یاد پڑی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے جب کسی عالم کو بہت مزین لباس میں دیکھتا ہوں تو دل میں وسوسہ آتا ہے کہ شخص خالی خولی ہے باطنی نعمت

جس کے پاس ہوتی ہے وہ ظاہری نقش نگار سے مستغنی ہوجاتا ہے فرمایا کہ ایک بار مولانا عیسی صاحب مرحوم نے مجھ سے کہا کہ حضرت! زینت میں کیا حرج ہے اور یہ حدیث پڑھی: ان اللہ جمیل ویحب الجمال۔ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے تو میں نے کہا مولوی صاحب جب حقیقت منکشف ہوگی تو اس حدیث سے استدلال دھرارہ جائے گا اور صحیح مفہوم اس حدیث کا سمجھ میں آجائے گا۔ چنانچہ چند دن تھانہ بھون رہنے کے بعد غریبوں کی سی وضع ہوگئی اور گھڑی اچکن سب بھول گئے۔

شان عبدیت

ایک بار حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سڑک سے گزر رہے تھے سرکاری بھنگی سڑک پر جھاڑو لگا رہا تھا ایک عالم اور مخصوص رفیق نے آگے بڑھ کر مہتر سے کہا بھائی ذرا دیر ملتوی کردو تاکہ ہمارے حضرت گرد سے بچ جائیں۔ حضرت والا نے سن لیا اور فرمایا کہ آپ کو کیا حق تھا کہ اس کے سرکاری کام میں دخل دیں وہ اپنی ملازمت کا حق ادا کررہا ہے کیا آپ نے مجھے فرعون سمجھ لیا ہے اللہ اکبر! عجیب عبدیت کی شان تھی۔ ایک بار ضلع کے ایک حاجی صاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے جمعہ کا دن تھا حضرت اپنے کرتے پائجامہ میں تشریف لائے حاجی صاحب معمر آدمی تھے بے تکلف تھے عرض کیا کہ حضرت آپ نے عبا نہیں پہنا فرمایا کہ عبا بڑوں کا لباس ہے حاجی صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آپ بھی تو بڑے ہیں فرمایا کہ میں کیا بڑا ہوں ابھی تو میرا ایک خلق بھی درست نہیں ہوا اللہ کی کبریائی جن کے سامنے ہوتی ہے وہ اپنے کو سراپا تقصیر سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ[۵]

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں علم وحدیث کا سب سے عظیم مرکز شمار ہوتا ہے اور دارالعلوم میں صدارت تدریس کی عظیم مسند پر ہمیشہ ایسے علماء فائز رہے ہیں جو اپنے علم وفضل خصوصاً علم حدیث کے ساتھ زہد وتقویٰ اور سلوک ومعرفت میں یگانہ روزگار سمجھے جاتے ہیں اور طالبان علم ان سے علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ باطنی فیضان بھی حاصل کرتے ہیں۔

دارلعلوم دیوبند کے اس عظیم منصب پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ فائز ہوئے۔ انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبدالغنی مجدد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے تحصیل علوم کی تھی۔ حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ استاذ المشائخ ہیں۔ دہلی کے عربی کالج میں پرنسپل تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اکابرین دیوبند کے استاذ مفتی صدرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معاصرین میں سے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے بہترین ادیب وشاعر تھے۔

[۵] حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلہ نسب اور حضرت مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نسب ایک ہی ہے۔ دونوں حضرات آپس میں ہم زلف بھی ہیں اور ہم عمر بھی، دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا قدس سرہ کے فیض تعلیم وتربیت نے بہت سے ممتاز علماء پیدا کئے جو آسمان علم وفضل کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکے، جن میں مولانا عبداللہ امبیٹھوی، مولانا فتح محمد سہارنپوری، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا حکیم منصور علی خاں مرادآبادی، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد احمد قاسمی اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمہم اللہ جیسے مشاہیر اور یگانہ عصر علماء شامل ہیں۔ حضرت مولانا اور ان کے تلامذہ کے فیض تعلیم کو دیکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوپاک، بنگلہ دیش، افغانستان اور وسط ایشیاء میں جس قدر علماء موجود ہیں ان کی بڑی تعداد اسی خوان علم کی زلہ ربا ہے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ علاوہ ہر فن میں ماہر ہونے کے بہت بڑے صاحب نسبت اور شیخ کامل بھی تھے۔ انہوں نے شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سلوک ومعرفت کے مقامات طے کئے تھے۔ اثر جذب وکیفیت کی حالت طاری رہتی تھی۔ دنیوی علائق کی جانب مطلق توجہ نہ تھی، اپنے زمانہ میں مجذوب وسالک مشہور تھے ہمارے شیخ ومربی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ ومربی حضرت مولانا یعقوب صاحب قدس سرہ کے اکثر اقوال واحوال حقائق ومعارف نہایت لطف لے کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ حلقہ درس کا ہوتا ہے۔ حلقہ توجہ ہوتا تھا یہ حال تھا تفسیر کا سبق ہو رہا ہے۔ آیات کا مطلب بیان فرمارہے ہیں اور آنکھوں سے زار وقطار آنسو جاری ہیں۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ باوجودیکہ مزاج میں جلال اور جذب کا غلبہ تھا۔ اور اس کے رعب واثر کا

یہ عالم تھا کہ لوگ بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے مگر آپ ہر شخص سے نہایت اخلاق وتواضع کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی طرح مزاج میں بڑا استغناء تھا جس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ ایک صاحب نے جن کو مولانا کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔ عرض کیا کہ فلاں نواب صاحب کی بڑی خواہش ہے کہ ایک مرتبہ آپ ان کے یہاں تشریف لے جائیں۔ مولانا نے فرمایا: ''ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے یہاں جاتا ہے، اس لئے شاید دوسو روپئے دیدیں۔ ارے میاں سو دوسو روپئے ہمارے کے دن کے، ہم وہاں جاکر مولویت کے نام پر دھبہ نہ لگائیں۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع علوم معقول ومنقول فاضل عالم ہونے کے علاوہ سالک ومجذوب بھی تھے۔ نہایت خوش وضع خلق اور خوش گفتار تھے، بڑے صاحب کمال ومکاشفات تھے جس زمانہ میں ملکہ برطانیہ کی تاج پوشی کا جلسہ ہوا، مولانا دہلی میں مقیم تھے اور دن میں اکثر غائب رہتے تھے۔ ''جب کسی نے دریافت کیا تو فرمایا کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ نواح دہلی میں جس جگہ تمہارا قدم جائے گا وہ جگہ آباد کردی جائے گی، اس لئے میں شہر کے اطراف میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران شدہ مقامات پھر سے آباد ہوجائیں۔'' چنانچہ دیکھا گیا کہ جن جن مقامات پر حضرت مولانا پھرتے تھے وہ جگہ نئی دہلی کے نام سے آباد ہوئی۔ ایک مرتبہ چھتہ مسجد میں یہ ذکر چھڑا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ایسا زبردست تسلط حاصل کرلیا ہے کہ ان کا اکھڑنا آسان نہیں رہا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مجلس میں موجود تھے۔ چونکہ کر بولے کیا کہا؟ رات کو ان کی حکمت ہوگی اور دن کو ان کی ہندوستان بغیر جنگ کے صف کی طرح پلٹ جائے گا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۴/۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی شب میں ایسا ہی نہیں ہوا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ نے اپنی حیات میں دو حج کئے۔ پہلا حج حضرت مولانا محمد

قاسم صاحب قدس سرہٗ کی معیت میں کیا گیا۔ حضرت مولانا ظفر حسین کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حاجی محمد عابد صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے۔ دوسری مرتبہ بھی علماء کی ایک بڑی جماعت کی معیت رہی۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد منیر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا حکیم ضیاء الدین رامپوری رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ حضرات کے علاوہ اس مقدس قافلے میں تقریباً سوافراد تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ شعروشاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ مولانا کا کلام اردو، فارسی میں بیاض یعقوبی میں درج ہے۔ اشعار میں قدرت کلام کیساتھ سوز وگداز اور درد واثر پایا جاتا ہے۔ تصانیف میں کئی رسالے ان کی یادگار ہیں۔ سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اگر چہ بہت مختصر سوانح ہے مگر زبان وبیان اور حالات واقعات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہیں، اسی طرح سے ''مکتوب یعقوبی'' جو مولانا کے خطوط ہیں اور طریقت وسلوک کے بارے میں بہترین دستور العمل ہیں۔ ''بیاض یعقوبی'' سفر حج کے حالات، کتب احادیث کی اسانید، منظومات اور عملیات پر مشتمل ہے۔ الغرض حضرت مولانا یعقوب صاحب قدس سرہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے شیخ الحدیث تھے۔ اس وقت یہ منصب صدر مدرس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

آپ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم میں تشریف لائے اور تقریباً اٹھارہ سال دارالعلوم دیوبند میں اسی منصب جلیلہ پر فائز رہے۔ دارالعلوم کی عظمت وشہرت میں حضرت مولانا قدس سرہ کے علم وفضل کا بڑا حصہ ہے۔ وفات سے کچھ روز قبل اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے اور ۳؍ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو بہ مرض فالج داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حق تعالیٰ درجات بلند فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ [۶]

تاریخ حریت میں تین نام ایسے ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی زبوں حالی کا سبب اور اس کا علاج دونوں صاف صاف بیان کر دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلا نام تو اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ دوسرا نام اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جنہوں نے اپنے اشعار کے ذریعے برملا اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کی پستی کا سبب محض قرآن سے روگردانی ہے اور اگر مسلمان بطور ملت اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی ذریعہ اور واسطہ ہے کہ ہمیں قرآن کی تعلیم اور قرآن کی تبلیغ کی طرف لوٹ آنا چاہئے۔ تیسری شخصیت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے کہ جن کی زندگی کا بغور جائزہ لیا جائے تو انہیں ہر لحاظ سے مبلغ قرآن قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر انہوں نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا تو اس کی وجہ بھی قرآن کا ہی تقاضا تھا اور اگر انہوں نے رد قادیانیت یا ختم نبوت کے تصور اور عقیدہ کے تحفظ کے لئے پوری زندگی وقف کردی تو یہ بھی قرآن پاک کی عظمت کا پرتو اور دین حقہ کے اظہار کا ذریعہ تھا کہ قرآن ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عقیدہ ختم نبوت ﷺ کا ہر حال میں تحفظ کیا جائے کہ یہ عقیدہ دین حق کا ایک

۶ ماخوذ: فیضان گنگوہی، مولف: محمد ادریس جہان رحیمی، مطبوعہ رحیمی کتب خانہ بنگلور

بنیادی عقیدہ ہے اوواگر غلامی کے خلاف آپ نے سر پر کفن باندھ کر انگریزی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کئے رکھا اور انتہائی صبر اور استقامت کے ساتھ ہر قسم کی آزمائش میں اللہ کے فضل وکرم سے سرخرو رہے تو یہ بھی قرآن پاک کا ہی تقاضا تھا، آپ کی تقریریں محض قرآن پاک کی تشریح، وضاحت تقاضوں اور ضرورت پر ہمیشہ زور دیتی تھیں اور یہ اس لئے کہ امیر شریعت بھی مندرجہ بالا دونوں مقتدر شخصیتوں کی طرح یہ بات کہتے تھے کہ جب تک مسلمان دوبارہ قرآن تقاضوں کو پورا نہیں کرتے موجودہ زبوں حالی سے نجات ممکن ہی نہیں نہ غلامی سے نجات حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔

اگر امیر شریعت کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ انہوں نے تمام عمر قرآن سنانے اور قرآنی اسرار اور رموز ملت کے افراد کو سمجھانے میں صرف کردی تو اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں، بڑے بڑے جید علماء کرام اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن فہمی کا وصف وافر عطا فرمایا ہے۔ جو ہر ایک کے لئے نہیں ہوتا۔

اب آیئے آپ کو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے ان فرمودات سے روشناس کرائیں جو انہوں نے قرآن کی عظمت، قرآن کی جلالت کے بارے میں ارشاد فرمائے تاکہ معلوم ہو کہ ان کی قرآن کی تبلیغ کا معیار کس قدر بلند تھا آپ فرماتے ہیں کہ ''میں نے بے حد غور کیا لیکن مجھے الحمد سے لے کر والناس تک کہیں بھی یہ نظر نہیں آیا کہ مسلمان غیر مسلم کی رعایا بن کے کیونکر زندگی بسر کرے۔ البتہ اسلامی حکومت میں غیر مسلم کے ساتھ طرز عمل کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ ایک ایسی قوم جو کرہ ارض پر حکومت کے لئے پیدا کی گئی ہے آج سراب منزل میں گرفتار ہے اور سیدھی راہ سے بھٹک چکی ہے یاد رہے کہ مسلمانوں کی حکومت اور چیز

ہے اور قرآن کی حکومت اور۔ ہمارا مطالبہ مسلمانوں کی حکومت کے مدعیوں سے قرآن کی حکمت کے قیام کا ہے تاکہ زندگی کا اضطراب باقی نہ رہے یہ کیا غضب ہے کہ کائنات ارض وسماء کی ہر جنس آئین قدرت کی فرمانبرداری میں مصروف ہے اور آپ معاشرت انسانی کی ترتیب کے لئے قانون الٰہی کی قرآنی صداؤں کو اپنے دماغوں کی آئین سازی پر قربان کررہے ہیں اور بزعم خویش یہ سمجھ لیا ہے کہ قرآن محض عقائد کا مجموعہ ہے اس میں اصول سلطنت کی کوئی دفعہ نہیں''۔ (سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ)

مولانا جوہر نے آپ کے بارے میں کہا کہ عطاء اللہ تقریر نہیں جادو کرتا ہے، کہ یہ محض جادو بھی نہیں ہے اس میں قصوں کے ساتھ ساتھ جنوں بھی ہے اور جنوں ہی وہ واحد جذبہ محرکہ ہے جو زندگی کی ہر مشکل اور ہر تکلیف پر انسان کو غلبہ پانے میں ایک موثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ امیر شریعت کی زندگی انتہائی مشکل زندگی ہونے کے باوجود ان پر گراں نہیں گزری بلکہ انہیں اپنی زندگی پر ناز تھا کہ کام آئی اور وہ ہر طرح سے اطمینان بخش زندگی تھی۔

۱۹۴۱ء میں تحریک خلافت کے سلسلے میں امیر شریعت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ جب گرفتار ہوئے تو انہیں لاہور سینٹرل جیل کے، گورا وارڈ، میں قید کردیا گیا ابھی دو ہفتے ہی گزرے تھے کہ اچانک ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل نے شاہ جی کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور انگریزی میں لکھی ہوئی ایک درخواست پیش کی وہ اس پر دستخط کردیں۔ اس پر لکھا تھا۔ ''اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کردے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہوگی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت ہو''۔ شاہ جی نے اس معافی نامے کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ان کو روندا اور تین دفعہ ان پر تھوکا، پھر غضب ناک ہوکر واپس لوٹ گئے، اس واقعے کی چند ہی روز بعد شاہ جی کو پنجاب کی سخت ترین جیل ڈسٹرکٹ جیل میانوالی منتقل کردیا گیا۔ قید کی مدت ختم

ہونے میں ابھی چند ماہ باقی تھے کہ ایک بار پھر یہی عمل دہرایا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے معافی نامہ دستخط کے لئے پیش کیا شاہ جی نے فرمایا: میں کچھ کہتا ہوں، اس پر معافی نامہ لکھو گئے؟'' سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا، جی ہاں! شاہ جی نے فرمایا ''تو پھر لکھو میں جب تک زندہ رہوں، تمہاری جڑوں کو کاٹتا رہوں گا''۔

حضرت امام عصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک ختم نبوت کو باقاعدہ منظّم کرنے کے لئے خطیب الامت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو امیر شریعت مقرر کیا اور انجمن خدام الدین کے ایک عظیم الشان اجلاس منعقدہ مارچ ۱۹۳۰ء میں ان کے ہاتھ میں دے کر ہندوستان کے ممتاز ترین پانچ سو علماء کی بیعت ان کے ہاتھ میں کرائی۔ ظاہر بین نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دارالعلوم دیوبند کا صدر المدرسین حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہا تھا لیکن خود ''امیر شریعت'' کا تاثر یہ تھا کہ: ''آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت (مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ) نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے بلکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمایا ہے''۔

یہ کہہ کر شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ زار و قطار رونے لگے اور ان کا سارا جسم کانپنے لگا۔ بہر حال یہ بحث تو اپنی جگہ ہے کہ حضرت امام العصر کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، حضرت امیر شریعت کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے ان سے فتنہ قادیانیت کے استیصال کا عہد لے رہے تھے؟ مگر اس میں کیا شک ہے کہ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی جماعت عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت نے قادیانیت کے محاذ پر جو کام کیا وہ حضرت امام العصر رحمۃ اللہ علیہ کی باطنی توجہ اور دعاہائے سحری کا ثمر تھا۔

تحریک ختم نبوت کے بعد جب قید سے رہا ہو چکے تھے غالباً ۱۹۵۵ء میں فیصل آباد دھوبی گھاٹ کے میدان میں ضعیفی اور علالت کے سبب باہر بیٹھ کر تقریر فرما رہے

تھے۔ دوران تقریر میں کسی نے ایک چٹ بھیج دی لکھا ہوا تھا کہ جو لوگ ختم نبوت کی تحریک میں شہید ہو گئے۔ ان کا ذمہ دار کون ہے؟ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھا تو جوش میں آ کر کھڑے ہو گئے اور گرج کر فرمایا۔ سنو ان شہداء کا ذمہ دار میں ہوں۔ نہیں نہیں آئندہ بھی جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی خاطر شہید ہوں گے۔ ان کا بھی ذمہ دار ہوں۔ تم بھی گواہ رہو (اور آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا) اے اللہ تو بھی گواہ رہ ان شہداء کا میں خود ذمہ دار ہوں اور جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، اگر میں زندہ رہا اور موقع ملا تو پھر بھی ایسا ہی ہوگا۔ اگر کل مسلمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتی کے تسمے پر قربان ہو جائیں تو پھر بھی حق ادا نہ ہوگا۔ ان جملوں سے سامعین تڑپ اٹھے۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور ختم نبوت زندہ باد کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھی۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مسٹر جسٹس منیر نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت میں ایک دن حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سے عدالت کے کٹہرے میں پوچھا کہ سنا ہے آپ کہتے ہیں کہ اگر مرزا قادیانی میرے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کرتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔ شاہ جی نے برجستہ جواب فرمایا کہ ''اب کوئی کر کے دیکھ لے''۔ اس پر عدالت میں سامعین نے نعرہ تکبیر لگایا۔ اللہ اکبر کی صدا سے ہائی کورٹ کے در و دیوار گونج اٹھے۔ جسٹس منیر سر پٹاتے ہوئے بولا کہ ''توہین عدالت'' شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے سخت آواز میں فرمایا کہ ''توہین رسالت''؟ اس پر پھر عدالت میں تاج و تخت ختم نبوت زندہ باد کی صدا بلند ہوئی، جج نے سر جھکا لیا۔ باطل ہار گیا حق جیت گیا۔

حضرت مولانا محمد علی صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وفات کے بعد خواب میں مجھے حضرت بخاری رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی زیارت ہوئی۔ ان سے پوچھا شاہ صاحب فرمائیے قبر کا معاملہ کیسا رہا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بھائی یہ منزل بہت ہی مشکل ہے، آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کی برکت سے معافی مل گئی''۔

حضرت مولانا محمد علی جالندھری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مولانا رسول خان جو پاکستان کے بڑے محدث اور استاذ الکل ہیں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تشریف فرما ہیں۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں (ایک شت میں آسمانوں سے) ایک دستار مبارک لائی گئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ اٹھو اور میرے بیٹے عطاء اللہ شاہ کے سر پر باندھ دو۔ میں اس سے خوش ہوں کہ اس نے میری ختم نبوت کے لئے بہت سارا کام کیا ہے۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے خود یا اور کسی صحابی رضی اللہ عنہ کو کیوں حکم نہ دیا کہ بخاری صاحب کے سر پر دستار باندھ دو، بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ اس طرف اشارہ کرنا مقصود تھا کہ سب سے پہلے ختم نبوت کا تحفظ مسیلمہ کذاب کے زمانہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا تھا۔ اب پاکستان میں مسیلمہ کذاب پنجاب کا مقابلہ وختم نبوت کا تحفظ بخاری صاحب نے کیا۔ گویا ختم نبوت کا ایک محافظ دوسرے ختم نبوت کے محافظ کو دستار بندی کرادے۔ ایک بار آپ نے وجد میں فرمایا کہ اگر میری قبر پر کان لگا کر سننے کی قدرت تمہیں طاقت بخشے تو سن لینا کہ میری قبر کا ذرہ ذرہ پکار رہا ہوگا کہ ''مرزا قادیانی اور اس کے ماننے والے کافر ہیں۔''

ادھر تحریک کی اندوہناک پسپائی سے لوگوں میں مایوسی کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ کئی لوگ ان شہداء کے متعلق جو اس تحریک ناموس ختم نبوت پر قربان ہو چکے تھے یہ سوال کرتے کہ ان کے خون کا ذمہ دار کون ہے؟ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے لاہور کے ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ جو لوگ تحریک ختم نبوت میں جہاں تہاں شہید ہوئے ان کے خون کا جوابدہ میں ہوں وہ عشق رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں مارے گئے۔ اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ان میں جذبہ شہادت میں نے پھونکا تھا۔ جو لوگ ان کے خون سے دامن بچانا چاہتے اور ہمارے ساتھ رہ کر اب کئی کترا

رہے ہیں۔ ان سے کہتا ہوں کہ میں حشر کے دن بھی ان کے خون کا ذمہ دار ہوں گا۔ وہ عشق نبوت میں اسلامی سلطنت کے بلاکو خانوں کی بھینٹ ہو گئے، لیکن ختم نبوت سے بڑ کر کوئی چیز نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی سات سو حافظ قرآن اسی مسئلہ کی خاطر شہید کر دیئے گئے۔

مولانا قاری محمد حنیف صاحب ملتانی اپنی ایک تقریر میں فرماتے ہیں کہ میں حج کے لئے مکہ مکرمہ گیا۔ میری ملاقات ایک ولی اللہ مولانا خیر محمد صاحب سے ہوئی جو بہاولپور میں رہتے تھے۔ سارا دن اپنے ہاتھوں سے کام کرتے اور شام کو طالب علموں کو حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا خیر محمد صاحب نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ بیت اللہ کا طواف ہو رہا ہے۔ خلیل اللہ طواف کر رہے ہیں۔ کلیم اللہ طواف کر رہے ہیں۔ آدم علیہ السلام ذبیح اللہ علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام اور حضرت ایوب علیہ السلام موجود ہیں۔ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جماعت طواف کر رہی ہے۔ اور پیچھے پیچھے سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ چل رہے ہیں۔ مولانا خیر محمد صاحب فرماتے ہیں۔ میں نے پوچھا شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ! یہ مرتبہ کیسے ملا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ بیت اللہ کا طواف، تو شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے، بس اللہ تعالیٰ نے یوں کریمی فرمادی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ تم نے میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے لئے زندگی جیل میں کاٹ دی۔ مصیبتوں اور دکھوں میں گزار دی۔ آ جانبیوں کے ساتھ طواف کرتا رہ۔

☆☆☆

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ [1]

''دونقطوں کے درمیان جس طرح خط مستقیم بھی ایک ہی ہوسکتی ہے۔اسلام جب اپنے آپ کو صراط مستقیم کہتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ لازم آجاتا ہے کہ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ ان سب کو غلط اور ٹیڑھے راستے قرار دے۔کسی راستے کو صراط مستقیم بھی کہنا اور پھر مختلف راستوں کو راہ راست بھی قرار دینا، کسی صاحب عقل کا کام نہیں ہے''۔ (تفہیمات:۱) اگر کوئی شخص مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ کی یہ تحریر جو چند سطروں پر مشتمل ہے پڑھے اور غور وفکر سے کام لے تو اسے انکار کرنے کی جرأت اسی وقت ہوسکتی ہے جب وہ راہ مستقیم کے بجائے کسی دوسری راہ پر چلنا اور دوسروں کو چلانا چاہتا ہے محض اس لئے کہ دنیاوی لحاظ سے راہ مستقیم پر چلنے سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا اور وہ گھاٹے میں رہے گا۔ مولانا آزاد ؒ اور مولانا مودودی ؒ، مولانا مودودی ؒ نے تحریر کے لئے خیال کو اولیت دی ہے الفاظ اور عبارت آرائی کو ثانوی حیثیت، وہ خود فرماتے ہیں کہ خیال پیش کرنے سے الفاظ خود بخود آتے جائیں گے، تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ مسلم لیگ کے ایک رہنما اور سابق سفیر احمد سعید کرمانی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ممتاز حسن (سابق گورنر سٹیٹ بینک آف

[1] ماخوذ: فیضان گنگوہی مولف محمد ادریس حبان رحیمی، مطبوعہ رحیمی کتب خانہ بنگلور

پاکستان) ایک مرتبہ کراچی میں ایک تقریب میں میرے ساتھ تھے، اس تقریب کی صدارت میں کررہا تھا۔ممتاز حسن بہت بڑے ادیب بھی تھے۔ان سے میں نے پوچھا کہ:''مولانا ابوالکلام آزاد ؒ کا مقام اونچا ہے یا مولانا ؒ کا؟'' تو انہوں نے جواباً کہا:''مولانا آزاد ؒ کی تحریروں میں ادبیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے جب کہ مولانا مودودی ؒ کو عقلیات پر دسترس حاصل ہے۔اس پہلو سے انہوں نے عوام کو زیادہ متاثر کیا ہے۔جو انہیں پڑھ لیتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں لہٰذا مولانا مودودی ؒ کا اونچا مقام ہے۔'' پاکستانی ادیب اور دانشور فاروق اعظم نے صاحب ''الہلال'' اور صاحب 'ترجمان القرآن' کی تحریروں کا موازانہ کرتے ہوئے درست فرمایا ہے:''الہلال'' کی عبارت میں ایک کڑک اور چمک ہے جو بحروں کی موجوں میں ایک اضطراب پیدا کردیتی ہے لیکن قاری پر بہت پائیدار اثر نہیں چھوڑتی۔ وہ آتش نمرود میں بے خطر کود پڑنے پر آمادہ ضرور کرتی ہے مگر مولانا مودودی ؒ کی طرح ایک ایسا ٹھنڈا استدلال نہیں رکھتی جو نمرود وقت کو استدلال کی قوت سے توحید کا قائل کردے۔ بیشک مولانا آزاد بہ یک جنبش قلم دست بوسی ہی نہیں پابوسی بھی کراسکتے ہیں لیکن مولانا مودودی ؒ لوگوں کو آہستہ آہستہ اپنا گرویدہ بناتے ہیں۔ان کی تصنیف آتش نمرود کو گلزار بنانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔مولانا آزاد ؒ اپنے قلم سے صور اسرافیل پھونک کر محشر بپا کردیتے ہیں لیکن پل صراط پار نہیں کراتے، لیکن مولانا مودودی ؒ پل صراط پار کرانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔'' مولانا مودودی ؒ حقیقت میں جس قدر زہد وتقویٰ سے لیس، منکسر المزاجی سے آراستہ اور پیراستہ، اسی قدر بے پناہ اور غیر معمولی ریاضت اور مشقت کرنے والے تھے۔ ہندو پاک کے ایک عظیم ادیب اور دانشور ہارون رشید نے مولانا کی انکساری اور ریاضیت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے:''مولانا امین احسن اصلاحی ؒ دارالاسلام پہنچے اور ان کا

سامان تانگے سے اتارا جارہا تھا۔ جذبات سے مغلوب نہ ہونے والے ابوالاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ اس منظر کو دیکھتے رہے، معاً ان کی آنکھوں میں نمی آ گئی اور انہوں نے کہا: ''آن تک میں ایک تھا اور اب دو ہو گیا ہوں۔'' ادھر مولانا امین حسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کا مزاج یہ تھا کہ دارالاسلام میں ان کے درس قرآن کے دوران ایک بار جب کسی نے یہ کہا کہ ابوالاعلیٰ کی رائے اس باب میں مختلف ہے، تو انکا جواب یہ تھا: ''انہیں کیا پتا؟'' ابوالاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ اس پر مسکرا دیئے۔ انہی برسوں میں سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تو ایک روایت کے مطابق مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اس کام میں ہاتھ نہ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ مولانا امین حسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً ایک بڑے عالم تھے اور انہوں نے قرآن کریم پر غور وفکر اور تدبر کا سلیقہ اپنے عہد کے عظیم اسکالر مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے سیکھا تھا لیکن ایک بات وہ سمجھ نہ سکے کہ ابوالاعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ کتنی ریاضت کے آدمی ہیں اور اللہ نے انہیں کیسا دماغ عطا کیا ہے۔ مسلمانوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر بہت کم غور کیا ہے کہ اگر آدمی زہد اختیار کرے تو اسے یوں علم عطا کیا جائے گا جس طرح کنویں سے پانی نکلتا ہے۔ ''تفہیم القرآن'' کے لئے ریاضت ومشقت مولانا جان محمد بھٹو نے اپنے ایک انٹرویو میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے کچھ دلچسپ واقعات سنائے ہیں۔ انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے: ''یہ غالباً ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ ہمارے گاؤں کے قریب نوڈیرو میں ایک شخص کے پاس گردے کے علاج کے لئے ایک جڑی بوٹی تھی۔ مولانا محترم کو گردے کی شکایت پرانی تھی۔ طے ہوا کہ مولانا یہاں نوڈیرو تشریف لائیں اور تین روز قیام فرمائیں اور یہ بوٹی استعمال کریں۔ میں نے خان صاحب احمد خان بھٹو سے جو ذوالفقار علی بھٹو کے سسر تھے تین روز کے لئے ان کا بنگلہ لے لیا جو مولانا نائے محترم کے قیام کے لئے استعمال کیا جانا تھا۔ مولانا تشریف لائے اور وہیں قیام کیا۔ ایک روز

رات کو شدید آندھی آئی اور بجلی فیل ہوگئی اور بارش ہونے لگی۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ چارپائیاں اندر کی جائیں۔ مولانا نے مجھ سے دریافت کیا کہ ذرا وقت تو بتایئے۔ میں ٹارچ لینے بستر کی طرف بڑھا تاکہ گھڑی دیکھ کر وقت بتا سکوں، مگر اس سے پہلے کہ میں وقت بتاتا۔ مولانا نے فرمایا کہ تین بجے ہوں گے! میں گھڑی کی طرف دیکھا تو ٹھیک تین بجے تھے۔ میں نے حیرانگی سے پوچھا کہ مولانا آپ نے کیسے بتا دیا کہ تین بجے ہیں؟ جنوب کی طرف مطلع ذرا صاف تھا۔ ادھر اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ وہ جو ستارہ چمک رہا ہے اس موسم میں جب موجود مقام پر آتا ہے تو صبح کے تین بج چکے ہوتے ہیں۔ میں نے تیس سال کی مدت مسلسل راتیں جاگ کر تفہیم القرآن کے لئے مواد اکٹھا کرنے اور اسے ترتیب دینے میں صرف کی ہے چنانچہ مجھے اب معلوم ہے کہ فلاں ستارہ فلاں موسم میں فلاں جگہ ہو تو یہ وقت ہوتا ہے۔'' مولانا کی تحریر میں جہاں ریاضت ومشقت کا زبردست ہاتھ ہے وہاں اسلام کا غیر معمولی مطالعہ اور اسلام پر غیر معمولی ایمان ویقین جس میں ان کا کوئی ہمسر دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسلام کا اقتصادی نظام'' نامی کتاب لکھی جس میں اسلام کے نظام معیشت پر بہت سا قیمتی مواد جمع کیا تھا۔ لیکن آخر میں لکھا کہ یہ معاشی انقلاب دو نظریوں میں سے ایک نظریہ ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ ایک خالص اسلامی نظریہ، دوسرا اشتراکی نظریہ، اس کے بعد داعیٔ انداز میں فرماتے ہیں۔ ''بلاخوف لومۃ لائم، اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ملک میں سردست پہلا نظریہ یعنی اسلامی نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا، بلکہ دوسرا نظریہ ہی (اشتراکی نظریۂ معاشیات) ممکن الوقوع ہے۔'' جب کسی نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ مولانا سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تحریر کی طرف مبذول کرائی تو مولانا نے کہا کہ پھر مولانا سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ کو اس نظریہ کو پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی جو

جامۂ عمل ہی نہیں پہن سکتا۔ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمایئے: ''مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات بیشتر صحیح ہیں اور ان کی تحریک میں نظری طور پر کوئی غلطی اور گمراہی نہیں ہے، صرف یہ بات محل غور ہے کہ موجودہ دور میں اس تحریک کے مفید اور بارآور ہونے کے لئے ظروف مساعد ہیں یا نہیں، اور یہ کہ محرک صاحب حال ہے یا صرف صاحب قال۔'' حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ بہت سی تحریروں اور رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے، مجھ کو اس قدر فرصت نہیں کہ بالاستیعاب دیکھوں۔ جس قدر مضامین نظر سے گزرے ہیں، حالات موجودہ میں ناممکن العمل ہیں واللہ اعلم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودہ دور میں اور اس ماحول میں کیا شرعی تکلیف ہم پر، ان سب امور میں حسب تصریحات ہوتی ہیں یا نہیں۔ جمعیت علماء نے جو طریقہ سیاست میں اختیار کیا ہے وہ حسب استطاعت اھون البلیتین کی بنا پر کیا ہے، موجودہ گرد وپیش میں جو طاقت اور قوت موجود ہے، اسی پر ان کی حرکت وسکون کا مدار ہے۔ مودودی صاحب جو فلسفہ پیش فرمارہے ہیں اس کے دیکھنے اور اس پر تنقید وتبصرہ کرنے یا اس کا جواب لکھنے کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اگر آتی بھی ہے تو فرصت نہیں۔ مودودی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے موافقین اپنے عمل کو حرکت میں لائیں، ہم ان کا مقابلہ نہیں کریں گے، اگر ہماری سمجھ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہی عمل شرعی اور مفید سمجھ میں آیا تو ہم بھی متبع بن جائیں گے ورنہ حسب قاعدہ شرعیہ **لایکلف اللہ نفساً الا وسعھا** ہم معذور ہوں گے۔'' یہ تینوں بزرگ قابل صد احترام مگر جب ان بزرگوں کی تحریروں کی روشنی میں مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے یقین وعمل کا جائزہ لیا جائے تو اپنے یقین کے لحاظ سے پہاڑ ثابت ہوتے ہیں اور اپنے عمل کے لحاظ سے ایسا الماس جو اس سے ٹکرائے وہ خود پاش پاش ہوجائے۔ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کا حق پر بے پناہ یقین تھا

وہ ہمیشہ حق کی جیت ہی کے قائل تھے۔: ''اللہ تعالیٰ کی مرضی کے آگے سر جھکا دینا اور جو کچھ اس کی طرف سے آئے اسے برحق سمجھنا ایک مومن کے عین ایمان کا تقاضا ہے''۔ (مکاتب سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ)

حق کے متعلق یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ بجائے خود 'حق' ہے۔ وہ ایسی مستقل اقدار کا نام ہے جو سراسر صحیح اور صادق ہیں اگر تمام دنیا اس سے منحرف ہوجائے تب بھی وہ حق ہی ہے کیوں کہ اس کا حق ہونا اس شرط سے مشروط نہیں ہے کہ دنیا اس کو مان لے، دنیا کا ماننا یا نہ ماننا سرے سے حق وباطل کے فیصلے کا معیار ہی نہیں ہے۔ اگر دنیا حق کو نہیں مانتی تو حق ناکام نہیں ہے۔ بلکہ ناکام وہ دنیا ہے جس نے اسے نہ مانا اور باطل کو قبول کرلیا، مصائب حق پر نہیں بلکہ اہل حق پر آتے ہیں لیکن جو لوگ سوچ سمجھ کر کامل قلبی اطمینان کے ساتھ یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ نہیں بہرحال حق پر ہی قائم رہنا اور اسی کا بول بالا کرنے کے لئے اپنا سارا سرمایۂ حیات لگا دینا ہے وہ مصائب میں تو مبتلا ضرور ہوسکتے ہیں لیکن 'ناکام' کبھی نہیں ہوسکتے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض انبیاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے ساری عمر دین حق کی طرف دعوت دینے میں کھپادی اور ایک آدمی بھی ان پر ایمان نہ لایا، کیا ہم انہیں ناکام کہہ سکتے ہیں؟ نہیں، ناکام وہ قوم ہوئی جس نے انہیں رد کردیا اور باطل پرستوں کو اپنا رہنما بنایا۔ (مکاتب سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ) ''نظریہ کی کامیابی کے لئے خود اس کے اصولوں کی طاقت جس قدر ضروری ہے اسی قدر ان انسانوں کی سیرت، ان کے عمل اور ان کی قربانی وسرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔ زراعت کے طریقہ کی درستی، بیج کی صلاحیت، موسم کی موافقت، سب اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں مگر زمین اتنی حقیقت پسند ہے کہ جب تک کسان اپنے بہتے ہوئے پسینہ سے اور اپنی جفاکشی سے اس پر اپنا حق ثابت نہیں کردیتا، وہ لہلہاتی ہوئی کھیتی اگلنے کے لئے تیار نہیں

ہوتی''۔ (تحریک آزادی ہند اور مسلمان) حضرت شورش کشمیری کے ایک سوال کا جواب: اردو کے مشہور شاعر وادیب جناب شورش کشمیری نے مختصر لفظوں میں مولانا مودودی ؒ کی شخصیت کی جو تصویر کشی کی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ زبان شستہ، لہجہ رفتہ، قلم کے دھنی، خطابت کے غنی، جماعت اسلامی کی روح رواں بالفاظ دیگر امیر کارواں! تامل وتذبذب سے بیزار، نہ زندہ باد کے تمنائی نہ مردہ باد سے خائف، نہ رعب کھاتے ہیں، نہ رعب ڈالتے ہیں۔ قلم مصور، دماغ منور، تقریر میں کڑک نہ پھڑک، تحریر کی طرف الفاظ بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ لکھنے میں تلوار اور گرز دونوں سے کام لیتے ہیں۔ عام لیڈروں سے مختلف ہیں۔ ان لیڈروں کی طرح نہیں جو گھروں میں عوام کالانعام کہتے اور اخباروں میں پیغام دیتے ہیں، انہوں نے سیاست کو انتخاب نہیں کیا بلکہ سیاست نے انہیں انتخاب کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جرأت کے ساتھ اپنی کہتے، صبر کے ساتھ دوسروں کی سنتے ہیں'' مولانا کے بارے میں اور ان کی تحریروں کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور انشاء اللہ لکھا جائے گا۔ لیکن جو چھاپ انہوں نے اردو زبان پر چھوڑی ہے اور جو نقش مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا ہے وہ انمٹ ہے۔ بابائے اردو مولانا عبدالحق نے لکھا ہے کہ: ''مولانا مودودی ؒ نے اردو ادب کو شائستگی عطا کی ہے''۔ یہ شائستگی مولانا کی تحریر کے ہر جملے اور ہر عبارت میں جلوہ گر ہے۔ جہاں تک مولانا کی تحریروں کی چھاپ ہے وہ ہر جگہ اور ہر تحریر میں عیاں ہے اور نمایاں ہے۔ مولانا کی جو زبردست خوبی ہے وہ یہ ہے کہ جس روز سے مولانا نے اسلام کی حقانیت کو پیش کرنے کی کوشش شروع کی اسی روز سے جو نقطۂ نظر اسلام کے حق میں پیش کیا اس پر زندگی کے آخری لمحوں تک جمے رہے اور کبھی بھی اپنے موقف سے انحراف نہیں کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے شروع میں 'الہلال' اور 'البلاغ' میں جو پیغام پیش کیا وہ بعینہ وہی پیغام تھا جو مولانا مودودی زندگی بھر پیش

کرتے رہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود لکھا ہے کہ ''میں اسی راستے پر چلنا چاہتا تھا جس راستے پر مولانا مودودی ؒ چل رہے ہیں لیکن میں اس راستے پر قائم نہیں رہ سکا۔'' مولانا ابوالکلام آزاد نے 'حزب اللہ' نام کی جماعت قائم کی اور خود کو 'امام الہند' کے لقب سے پیش کرنے لگے اور حزب اللہ کے لئے بیعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ لیکن یہ تحریک چند سالوں تک چلی اور پھر اس کا وجود باقی نہ رہا۔ مولانا ابوالکلام آزاد بعد میں سیکولر سیاست کے راستے پر گامزن ہوگئے۔ علامہ اقبال اسلام کی حقانیت شروع شروع میں پیش کرنے سے قاصر رہے لیکن لندن کے سفر کی واپسی کے بعد اسلام کی حقانیت جب پیش کرنا شروع کیا تو زندگی کے آخری لمحے تک اپنے اس موقف پر قائم ودائم رہے۔ علامہ اقبال کو یہ بھی کریڈٹ حاصل ہے کہ انہوں نے مولانا مودودی ؒ کو حیدرآباد سے پنجاب بلایا اور مولانا کو یقین دلایا کہ وہ اپنے مشن کا آغاز اگر پنجاب سے کرتے ہیں تو یہاں انہیں کافی حمایت وتائید حاصل ہوگی۔ مولانا علامہ اقبال کی دعوت پر پنجاب آئے، دارالاسلام پٹھان کورٹ سے اپنے مشن کا آغاز کیا اور بعد میں لاہور میں بہت دنوں کی تبلیغ واشاعت کے بعد تحریک اسلامی کا خاکہ پیش کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی کا وجود عمل میں آیا۔ مولانا زندگی بھر طوفان سے گزرتے رہے یہاں تک انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی اور پھانسی کی کوٹھری میں بھی داخل کر دیا گیا۔ یہ سب وہ سہتے رہے مگر کہیں بھی، کسی بھی جگہ، کسی بھی مرحلے پر ان کے پاؤں میں لغزش نہیں آئی۔ وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے اور آخری دم تک یہ کہتے رہے کہ: ''ہمارا کام بہرحال اندھیروں میں چراغ جلانا ہی ہے اور ہم مرتے دم تک یہی کام کرتے رہیں گے۔ ہم اس سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں کہ ہم بھٹکنے یا بھٹکانے والوں میں شامل ہوجائیں۔ خدا کا یہ احسان ہے کہ اس اندھیروں میں چراغ جلانے کی توفیق بخشی۔ اس احسان کا شکر یہی ہے کہ ہم چراغ

ہی جلاتے جلاتے مرجائیں۔'' مولانا کا یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کا یہ بے پناہ جذبہ بیسویں صدی میں علامہ اقبال کے سوا کسی اور فرد میں نظر نہیں آتا۔ علامہ اقبال میں یہ جذبات یقیناً موجود تھے جو مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ میں موجود تھا لیکن علامہ اقبال بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اسلامی نظام کو کس طرح مکمل طریقے سے زمین پر نافذ العمل بنایا جاسکتا ہے اور کس طرح تحریک چلائی جاسکتی ہے کہ اسلام کے لئے لوگ جان نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مولانا مودودی کے بے پناہ مطالعے اور اسلام پر غیر معمولی یقین کے نتیجے میں ان کے ذہن میں وہ بات ڈالی جو آج دنیا بھر میں تحریک اسلامی کے کارکنوں، لیڈروں اور ہمدردوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔

☆☆☆

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ[۸]

یہ ۱۰ جنوری ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔ علامہ اقبال اپنے ارباب کے ساتھ نماز عید الفطر کی ادائیگی کے لئے شاہی مسجد لاہور پہنچے۔ ان کے دس سالہ فرزند جاوید اقبال اور ان کا وفا شعار خادم بھی ہمراہ تھے۔ اس روز صبح سے ہی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ علامہ اقبال کو ایسی سرد ہواؤں سے احتیاط کرنا لازمی تھا لیکن وہ اس معاملے میں بڑے لاپروا تھے۔ گھر پہنچ کر سویاں کھائیں، اپنے والد شیخ نور محمد کے تتبع میں دودھ کے بجائے دہی استعمال کیا۔ بس یہ ایک بہانہ ہوگیا دوسرے ہی دن وہ شدید سردی کا شکار ہوگئے۔ ویسے بچپن سے ہی یہ نزلہ زکام میں اکثر مبتلا ہوا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کا گلا بھی خراب رہا کرتا تھا۔ وقفہ وقفہ سے وہ زور زور سے کھنکارتے تھے۔ پھر آگے چل کر یہی کھانسی ضیق النفس (دمہ) کی شکل اختیار کرگئی۔ علاج بھی ہوا لیکن مکمل افاقہ نہ ہوسکا۔ ڈاکٹروں کی رائے پر X-Ray لیا گیا تو معلوم ہوا کہ دل پر کوئی شے ابھر رہی ہے۔ حکیم نابینا سے رجوع ہوئے۔ یونانی ادویہ کے ساتھ ساتھ ایلو پیتھک دواؤں کا استعمال جاری رہا۔ دواؤں کے بارے میں علامہ کا خیال تھا کہ دوا جو بھی ہو، لطیف ہو، خوش رنگ اور خوش ذائقہ ہو، بو بھی ناگوار نہ ہو، دوا کی خوراک کم ہو تو ہو لیکن

۸ ماخوذ: مئے لالہ فام، ڈاکر جاوید اقبال، اردو کا خاص نمبر۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

موثر ضرور ہو۔ حکیم نابینا کی دوائیں ایسی ہی ہوتیں لیکن پرہیز وغیرہ میں اختلاف ہوتا۔ حکیم صاحب کا اصرار تھا کہ علامہ خرگوش کا بھیجا استعمال کریں، لیکن علامہ اقبال سخت اختلاف کرتے ہوئے کہتے کہ معاذ اللہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے، مغز کے دیکھنے سے ہی کراہت ہوتی ہے۔ وہ گوشت تو کھا لیتے تھے لیکن دل، گردہ، کلیجی کبھی نہیں کھاتے تھے۔ حکیم نابینا کے علاج سے فائدہ ہوا اور ڈاکٹروں نے دل پر جس ابھار کا ذکر کیا تھا وہ غلط ثابت ہوا لیکن آواز پوری طرح ٹھیک نہ ہوسکی۔

صحت کی طرف سے جب اطمینان ہوا تو وہ از سرنو اپنے مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ علامہ کو مسلمانوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ انہوں نے جب علی گڑھ میں Anti God سوسائٹی کی تشکیل کا حال سنا تو وہ بہت مضطرب ہوگئے۔ ان کی ساری رات بے خوابی میں گزری اور صبح کی نماز میں ان کی گریہ وزاری کی کوئی انتہا نہ رہی۔ تھی۔ چند دن سے علامہ کی اہلیہ کی بیماری چل رہی تھی۔ دن بدن حالت تشویشناک ہوتی جارہی تھی۔ ان کے اپنے زیورات اور پس ماندہ رقم سے جو نیا مکان بنا تھا اس میں ان کو چارپائی پر لٹا کر لایا گیا تھا۔ اس مکان کو جاوید کے نام ہبہ کردیا گیا تھا۔ جو جاوید منزل کہلانے لگا تھا۔ مکان کے سامنے کے ۳ کمروں میں علامہ اقبال کرایہ دار کی حیثیت سے رہنے لگے اور ہر ماہ کی ۲۱ر تاریخ کو کرایہ ادا کرتے تھے۔ نئے مکان میں منتقل ہونے کے دوسرے ہی دن ۲۳ر مئی ۱۹۳۵ء کو ان کی اہلیہ (والدہ جاوید اقبال) اس جہان فانی سے کوچ کرگئیں۔

علامہ کہتے تھے کہ مرحومہ کے آلام ومصائب کا تو خاتمہ ہوگیا لیکن ساتھ ہی انکے اطمینان قلب کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ لیکن ہر چہ از دوست می رسد نیکوست (یعنی دوست کی طرف سے جو بھی پہنچے وہ ٹھیک ہی ہوتا ہے) ایک دن جاوید اور منیرہ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اقبال کے کمرے کی طرف گئے۔ اقبال کی

طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، گلا بیٹھا ہوا تھا، آواز صاف نہ نکل رہی تھی۔ ان دونوں کو روتا ہوا دیکھ کر اپنے پاس بلالیا۔ اور جاوید سے کہا۔ ''تمہیں یوں نہ رونا چاہئے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی رویا نہیں کرتے''۔ پھر دونوں کی پیشانیوں کو بار بار چوما۔

یہ زمانہ حضرت علامہ کیلئے بڑی پریشانیوں کا تھا۔ وکالت کا سلسلہ تین چار سال پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔ کسب مال اور حصول منصب کی کئی صورتیں ان کے سامنے پیش کی گئیں۔ لیکن ان کی فقیرانہ طبیعت، غیرت وخودداری نے اسکی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہ کیا۔ وہ کسی کے احسان اور منت پذیری کا خیال تک لانا گوارا نہ کرتے تھے۔ ان میں حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی جرأت تھی۔ وہ ایک مرد آزاد تھے جو موت کے انتظار میں نہیں بلکہ اصول اور نصب العین کی خاطر زندہ رہنے کو ترجیح دیتے۔ ان حالات میں نواب صاحب بھوپال نے اپنے تعلق خاطر اور خدمت اسلامی کے جذبے سے خود اپنی جیب خاص سے علامہ اقبال کیلئے ماہوار وظیفہ مقرر کردیا۔ تاکہ وہ پورے اطمینان قلب کے ساتھ قرآن مجید کے حقائق ومعارف پر قلم اٹھاسکیں۔ بجلی کے علاج کے سلسلے میں وہ بھوپال جاتے تو سرراس مسعود کے ہاں قیام فرماتے۔ سرراس مسعود اور لیڈی مسعود علامہ کے آرام کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ دونوں اقبال کو زینے چڑھتے وقت سہارا دیا کرتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں جب سرراس مسعود کی موت کا سانحہ پیش آیا تو حضرت علامہ کو بے حد صدمہ ہوا جب بھی ان کی یاد آتی ان کی آنکھیں اشکبار ہوجاتیں۔ علامہ اقبال کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا۔ وہ امیر غریب اپنے اور بیگانے سبھوں کو ایک ہی نظریہ سے دیکھتے۔ جو بھی ان سے ملتا ان کے انکسار، رواداری اور کشادہ دلی کا ایک گہرا نقش لے کر اٹھتا۔ ملنے والوں کو اس بات کا اطمینان تھا کہ جب تک ہمارے نبی ﷺ کا سچا عاشق اور ہمارے دین کا راز دار ہم میں موجود ہے ہمارے ہاں

ناامیدی اور مایوسی نہیں پھٹک سکتی۔ ۱۹۳۷ء میں جب حضرت علامہ کی صحت کچھ بہتر ہونے لگی تو سفر حج کے تعلق سے مختلف جہاز راں کمپنیوں سے خط وکتابت شروع کردی۔ ان کا خیال تھا کہ ۳۸ یا ۳۹ھ میں وہ اس قابل ہوجائیں گے کہ فریضہ حج کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہولیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ چنانچہ عالم تصور میں ہی اس مقدس سفر کی تمام منزلیں طے کرلیں۔

علامہ کی نظم، ''ذوق وشوق'' میں ان کے تاثرات کا پتہ چلتا ہے حج وزیارت کے شوق میں یہ اشعار بھی نکل آئے:

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
غزل خواں از سرور عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سر شام
کشاید پر بہ فکر آشیانہ!

(اپنی اس ضعیفی کے باوجود یثرب کی راہ پر چل پڑتا ہوں، عاشقانہ جذب وسرور میں غزل خولا ہوجاتا ہوں، اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت اپنے آشیانے کی طرف اڑنے کے لئے اپنے پر کھولتا ہے)۔

''ارمغان حجاز'' ایک طرح سے حجاز کا خیالی سفرنامہ ہے۔ علامہ اقبال کہا کرتے کہ اصل سفرنامہ تو وہ ہوگا جو حرمین پاک کی زیارت کے بعد لکھا جائے گا۔

اس طرح علامہ کی علالت کا سلسلہ کم وبیش چار سال تک چلتا رہا۔ بعض اوقات وہ اتنے کمزور دکھائی دیتے گویا ان کے بدن میں خون ہی نہیں ہے۔ لیکن ان کا حال یہ تھا کہ مزاج پرسی کرنے والوں سے کہتے ''الحمد للہ اچھا ہوں'' تاہم کبھی کبھی مایوس نظر آتے۔ علی بخش سے اکثر کہا کرتے کہ ۱۹۳۸ء بخیر گزر جائے تو سمجھو کہ میں اچھا ہوگیا ہوں۔ حکیم محمد حسین قریشی بڑے خلوص اور دل سوزی کے ساتھ علامہ کی خبر

گیری کرنے میں ہمیشہ مستعد رہتے۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ ان دونوں کا تعلق طبیب اور مریض کا نہیں بلکہ ایک عقیدت مند، دوست اور خدمت گزار کا تھا۔ وہ کئی یونانی مرکبات تیار کرتے اور صبح وشام ان کی خدمت میں حاضر رہتے۔ کبھی دوا کھلاتے۔ کبھی دلچسپ گفتگو سے علامہ کا دل بہلاتے۔ اقبال کہتے کہ میرا سب سے بڑا علاج یہی ہے کہ حکیم صاحب میرے پاس بیٹھے رہیں۔ علامہ کو ایلو پیتھک دوائیں بالکل پسند نہ تھیں وہ کہتے کہ یونانی دواؤں میں مسلمانوں کے ذوق جمال اور نفاست مزاج کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ خمیرہ گاؤزبان عنبری اور دواء المسک مزے لے لے کر کھاتے۔ حکیم محمد حسین قریشی کے علاوہ راجہ اختر حسن، چودھری محمد حسین اور سید نذیر نیازی علامہ کی تیمارداری کرتے اور رات دیر گئے تک علامہ کی خدمت میں حاضر رہتے۔ ایک دفعہ حضرت نے پلاؤ کی فرمائش کی تو حکیم قریشی صاحب نے پلاؤ کے بجائے کھچڑی تجویز کی تو فرمایا ''مگر کھچڑی بھنی ہوئی ہو۔ اور کافی گھی کیساتھ ہو''۔

علامہ اقبال نے اپنی علالت کے سارے مرحلوں کا بڑے حوصلے اور استقلال سے مقابلہ کیا۔ وہ مریض نظر آنا گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ خوف واضطراب کو اپنے پاس آنے نہ دیتے تھے۔ موت وحیات کے تعلق سے ان کا جو دلیرانہ رویہ تھا وہ آخری لمحہ تک برقرار رہا۔ زندگی کی آخری رات کو جاوید کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''میرے بیٹے! میں چاہتا ہوں کہ تم میں نظر پیدا ہوا''!! جب درد کی شدت بڑھ جاتی تو کہتے۔ ''اب اللہ ہی اللہ ہے''۔ اور کبھی کہتے ''یاد رکھو۔ اللہ کے سوا کچھ اور نہیں!''۔ ''میں نے اسلام کے لئے کیا کیا؟ اسلام کے لئے میری خدمت بس اتنی ہی ہے جیسے کوئی شخص فرط محبت سے سوئے ہوئے بچے کو پیار کرے!!''۔ کبھی وہ حدیث نبوی ﷺ پر گفتگو کرتے۔ انہوں نے فرمایا کہ ایک دفعہ رسالت مآب ﷺ اپنے بعض اصحاب کے ساتھ احد پہاڑ پر گئے تو پہاڑ کانپ اٹھا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے

علامہ نے کہا"Mind you! It is no metaphor" یاد رکھو یہ کوئی استعارہ نہیں ہے بلکہ واقعتاً احد پہاڑ کانپ اٹھا تھا۔ آپ کو نبی اکرم ﷺ سے کچھ ایسا عشق تھا کہ آپ ﷺ کا ذکر آتے ہی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ آخری ایام میں حضور ﷺ سے فرط ادب کا یہ حال تھا کہ آپ کا اسم گرامی زبان پر لانے سے پہلے اس امر کا اطمینان کر لیتے کہ ان کے ہوش وحواس تو بجا نہیں اور بدن کا حالت میں کوئی خرابی تو نہیں۔ حضور ﷺ سے محبت کا اندازہ علامہ کے ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

بہ پایاں چوں رسد ایں عالم پیر
شود بے پردہ ہر پوشیدہ تقدیر
مکن رسوا حضور خواجۂ مارا
حساب من ز چشم اور نہاں گیر!

جب یہ دنیا اپنے اختتام کو پہنچے گی۔ اور ہر پوشیدہ شے بے پردہ ہوجائے گی تو اے اللہ! مجھے حضور ﷺ کے سامنے رسوانہ کرنا اور میرا اعمالنامہ آپ ﷺ کی نگاہوں سے مخفی رکھنا!!

علالت کا ایک اور مرحلہ استسقاء کی شکل میں نمودار ہوا (یعنی پیٹ میں پانی بھر جانا) جس سے چہرے اور پاؤں پر ورم آ گیا۔ ڈاکٹروں نے مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کے بڑے بھائی شیخ محمد عطا نے ان سے چند تسلی آمیز کلمات کہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا: ''میں مسلمان ہوں میں موت سے نہیں ڈرتا'' پھر اپنے اس شعر کو دہرایا:

نشان مرد مومن با تو گویم
چومرگ آید تبسم بر لب اوست

(میں تجھے مرد مومن کی نشانی بتاتا ہوں۔ جب موت آتی ہے تو اس کے لبوں پر تبسم کھیلتا ہے)۔

۱۹/اپریل ۱۹۳۸ء کی شام سے علامہ اقبال بلغم کے ساتھ خون تھوکنے لگے۔ یہ بڑی یاس انگیز علامت تھی۔ شاید رات کے ۳ بجے ہوگے قرآن مجید اور حدیث شریف سنانے کی خواہش کی۔ پھر اس کے بعد غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ کوشش کی گئی کہ رات کی دوا پلائی جائے۔

علامہ نے سختی سے انکار کیا اور کہا'' کاش تم لوگ جانتے کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے'' پھر انہوں نے اپنی یہ رباعی پڑھی جو انہوں نے گزشتہ دسمبر میں کہی تھی:

سرود رفتہ باز آئید کہ نائید
نسیمے از حجاز آئید کہ نائید
سر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آئید کہ نائید

پھر علی بخش سے اپنے شانوں کو دبانے کے لئے کہا۔ یکا یک وہ لیٹ گئے۔ اور پاؤں پھیلا دیئے۔ دل پر ہاتھ رکھا اور کہا۔'' یا اللہ! میرے یہاں درد ہے!'' اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف ڈھلکنے لگا۔ علی بخش نے آگے بڑھ کر سہارا دیا تو انہوں نے قبلہ رو ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اہ اس طرح وہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی جو گزشتہ ۲۵ سال سے ملت اسلامیہ کے سینے کو سوزِ آرزو سے گرما رہی تھی۔ جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تگ گوش ہے۔ وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟ کمسن جاوید اقبال کو ان تمام حالات سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ لیکن طلوع آفتاب سے پہلے علی بخش نے اٹھایا اور کہا'' جاؤ، دیکھو تمہارے ابا جان کو کیا ہوگیا ہے!'' جاوید اقبال نیند سے جاگے تو سنا کہ گھر کے مختلف حصوں میں کراہنے اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھے تو ان کی بہن منیرہ تخت پر اکیلی بیٹھی چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ جاوید کو دیکھا تو ان سے چمٹ گئی۔ وہ دونوں

اقبال کے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ جاوید نے دیکھا کہ ان کے ابا جان چارپائی پر سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ گردن تک سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ چہرہ قبلہ رو تھا اور آنکھیں بند تھیں! منیرہ مارے خوف کے تھرا رہی تھی اور جاوید کے بازو کو بڑے زور سے پکڑ رکھا تھا۔ جاوید کوشش کے باوجود نہ رو سکے کیونکہ ان کو خوف تھا کہ اگر وہ رو دیں گے تو ابا جان فوراً اٹھ کھڑے ہوں گے اور قریب بلا کر کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہیں گے۔ ''تمہیں یوں نہ رونا چاہئے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی رویا نہیں کرتے!!''

آہ۔ خودی کا وہ پاسبان جاتا رہا جسے ناموس مشرق کا بڑا خیال تھا۔ جس کا دل ایمان سے لبریز رہتا تھا۔ جس نے ملت کو یہ پیام دیا تھا کہ:

در دل مسلم مقام مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰؐ است

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ!!

☆☆☆

شیخ الادب

مولانا اعزاز علی صاحب امروہیؒ[9]

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب امروہی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے مشہور اساتذہ میں سے تھے، ایسے اساتذہ میں سے کسی شخص نے ایک مرتبہ ان سے پڑھ لیا وہ عمر بھر ان کی بارعب شفقت کو بھلا نہ سکا، وہ اپنے شاگردوں کے لئے ایک ناقابل فراموش شخصیت تھے، دن رات پڑھنے پڑھانے میں غرق اور اپنے ایک ایک شاگرد کے ذاتی حالات تک سے واقف، پابندی وقت کے ساتھ درس وتدریس میں اسی طرح مشغول رہتے تھے کہ ان کو درس گاہ کے دروازے پر دیکھ کر گھڑی ملائی جاسکتی تھی، دارالعلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والا ہر شخص تو انہیں جانتا تھا، لیکن عوام میں ان کی شہرت اس لئے زیادہ نہیں ہوئی کہ نہ تقریر خطابت کے آدمی تھے۔ نہ سیاست کے ان کی اردو تصانیف بھی بہت کم ہیں (ان کی تقریباً تصانیف عربی میں ہیں، اور درسی موضوعات سے متعلق ہیں جن سے علماء دن رات فائدہ اٹھاتے ہیں) یوں بھی طبعی طور پر وہ نام ونمود سے کہیں دور اور گوشہ نشین بزرگ تھے جو شہرت کے اسباب سے

9 حضرت مولانا عبدالمنان صاحب ندوی، روزنامہ سالار ۱۲ر فروری ۲۰۱۰ء، ص: ۷

نفرت کرتے ہیں اوران کی ساری تگ ودو اپنے اللہ سے رابطہ استوار رکھنے میں صرف ہوتی ہے، وہ اپنی بے نام ونشان زندگی میں مگن رہتے ہیں اوران کی بے نام ونشان زندگی دوسروں کے لئے سینکڑوں نشان چھوڑ جاتی ہے۔

یہی حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی استاد تھے، ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دارالعلوم کے کچھ اور اساتذہ اکٹھے کسی سفر پر جانے لگے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان سب کے استاد تھے، اور وہ بھی ان کے ساتھ تشریف لے جارہے تھے، جب تمام حضرات ریلوے اسٹیشن پر جمع ہوکر ریل کا انتظار کرنے لگے تو حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ساتھیوں سے فرمایا کہ شریعت کے مطابق جب کئی افراد سفر پر جارہے ہوں تو انہیں اپنے میں سے کسی کو امیر بنالینا چاہئے۔ لہٰذا اپنے میں سے کسی کو امیر منتخب کرلو۔

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ ''حضرت انتخاب کا کیا سوال؟ امیر تو پہلے ہی ہم میں موجود ہیں'' (حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد خود مولانا کی طرف تھا) مولانا نے پوچھا ''کیا آپ مجھے امیر بنانا چاہتے ہیں؟''۔

جی ہاں! سب حضرات نے ایک آواز ہوکر جواب دیا، آپ کی موجودگی میں کسی اور کے امیر بننے کا سوال ہی کیا ہے؟

مولانا نے فرمایا ٹھیک ہے مجھے کوئی تکلیف یا اعتراض نہیں، لیکن یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ امیر کا حکم ماننا ضروری ہے آپ کو بھی میرے احکام ماننے ہوں گے۔

سب نے کہا کہ آپ کا حکم ویسے بھی ہمارے لئے واجب التعمیل ہے، امیر بننے کے بعد تو اور بھی زیادہ واجب الاطاعت ہوگا۔ اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تمام ساتھیوں سے حکم ماننے کا اقرار لے لیا، اور اطمینان سے ریل آنے کا انتظار کرنے لگے، تھوڑی دیر میں ریل آگئی تو مولانا رحمۃ اللہ علیہ بجلی کی سی پھرتی سے اپنی جگہ سے

اٹھے اور جلدی جلدی اپنے ساتھیوں کا سامان سمیٹ کر اٹھانے لگے، ایک عدد ہاتھ میں، ایک بغل میں ایک دوسرے ہاتھ میں اور اس طرح جتنے عدد خود اٹھا سکتے تھے انہوں نے خود اٹھالئے، ساتھی سب ان کے شاگرد تھے، اس لئے یہ صورت دیکھ کر بے تاب ہوگئے، اور ہر شخص نے آگے بڑھ کر مولانا کے ہاتھ سے سامان چھیننا چاہا، لیکن مولانا نے سختی سے سامان سنبھالے رکھا، اور جب ساتھیوں نے التجا کی کہ سامان ہمیں دیجئے تو مولانا نے فرمایا میں آپ سب کا امیر ہوں اور آپ وعدہ کرچکے ہیں کہ میرا کہنا مانیں گے۔ لہٰذا میں بحیثیت امیر آپ کو حکم دیتا ہوں کہ مجھے سامان اٹھانے دیں اور مجھ سے چھیننے کی کوشش نہ کریں۔

اس کے بعد پورے سفر میں مولانا کا معمول یہی رہا کہ جب کوئی محنت یا مشقت کا کام آتا مولانا خود آگے بڑھ کر وہ کام اپنے ہاتھوں سے کرتے، اور ساتھی اصرار کرتے تو ہر بار انہیں امیر کا حکم سنا کر ان کا وعدہ یاد دلا دیتے اور ساتھی لاجواب ہوکر رہ جاتے، یہاں تک کہ ایک موقع پر ایک بے تکلف شاگرد نے کہہ دیا کہ حضرت! ہم تو آپ کو امیر بنا کر بہت پچھتائے، مولانا جواب میں مسکرادیئے مطلب غالباً یہی تھا کہ امیر کا صحیح مطلب سمجھا نا بھی تو میری ذمہ داری تھی۔

یہ تھا امیر کا صحیح مفہوم جو حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی طرف سے ایجاد نہیں کرلیا تھا، بلکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے امیر کا یہی مطلب بتایا تھا، اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امیر بنے انہوں نے بھی اسی پر عمل کرکے دکھایا۔ لیکن ہوتے ہوتے ہم امیر اور سربراہ کا یہ مطلب بھول گئے اور اسی راستے پر چل پڑے جو قیصر کسریٰ کا راستہ تھا۔

اسلام کی تقریباً تین چوتھائی تعلیمات حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ اور ان کا محور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ''تمام لوگوں میں سب سے بہتر شخص وہ ہے

جولوگوں کو فائدہ پہنچائے'' یعنی ان کی خدمت کرے، خدمت کے رنگ اور انداز الگ الگ ہیں، لیکن سب کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان سب کا بھلا چاہے، اور ایثار سے کام لے کر دوسروں کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے۔

آج کی مادہ پرست دنیا میں ہم نے لذت وراحت کو روپے پیسے سے اس طرح وابستہ کرلیا ہے کہ ہم صرف اسی لذت کو لذت سمجھتے ہیں جو نوٹوں کی گنتی اور اسباب راحت کی فراہمی سے حاصل ہوتی ہے، ہمیں اس لذت اور قلبی کی ہوا بھی نہیں لگی جو اپنے کسی بھائی بہن کا دکھ دور کرکے یا اسے آرام پہنچا کر حاصل ہوتی ہے، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے خدمت خلق کا ذوق عطا فرمایا ہے، ان کے دل سے پوچھئے کہ کسی ضرورت مند کا کام کرکے یا کسی غمزدہ کے چہرے پر مسکراہٹ اور اطمینان لاکر قلب روح کو جو تسکین اور لذت میسر آتی ہے، اس کے آگے نفسانی خواہشات کی ساری لذتیں ہیچ ہیں۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے عہدے اور منصب ہیں ان میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جسے حاصل کرنا انسان کے اختیار میں ہو، اگر کوئی شخص کسی ملک، ادارے یا جماعت کا سربراہ بننا چاہے تو ہزار کوشش کے باوجود ضروری نہیں کہ اس مقصد میں کامیاب ہوجائے، کتنے لوگ ہیں جو یہی جدوجہد کرتے کرتے دنیا سے رخصت ہوگئے، لیکن اس عہدے تک نہ پہنچ سکے، پھر اگر کسی کو اس قسم کا کوئی عہدہ مل بھی جائے تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ وہ عہدہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو عہدہ ومنصب رکھنے والوں کے خلاف حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں، اور بہت سے انہیں اس عہدے سے اتارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اور بسا اوقات کامیاب بھی ہوجاتے ہیں، اور کل کے حکمران آج جیل کی کوٹھری نظر آتے ہیں، لیکن ان سارے عہدوں اور مناصب سے

ہٹ کر میں تمہیں ایسا مفت کا عہدہ بتاتا ہوں جس کا حصول تمہارے اپنے اختیار میں ہے، ہر شخص جب چاہے وہ عہدہ حاصل کرسکتا ہے اور جب تک انسان خود نہ چاہے کوئی دوسرا اس کو اس عہدے سے معزول نہیں کرسکتا وہ عہدہ ہے خادم کا عہدہ۔

اپنے آپ کو اللہ کی مخلوق کا خادم قرار دیدو، اور یہ طئے کرلو کہ میں جہاں کہیں ہوں گا اور جس حیثیت میں ہوں گا، دوسروں کی خدمت کی کوشش کروں گا، بس تمہیں اپنے اختیار سے یہ عہدہ مل گیا، اور یہ عہدہ ایسا ہے کہ نہ اس کی وجہ سے کوئی تم پر حسد کرے گا، نہ کوئی تم سے یہ منصب چھیننے کی کوشش کرے گا نہ کوئی تمہیں اس عہدے سے معزول کرسکے گا، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد تمہارا جو قدم اٹھے گا وہ عبادت شمار ہوگا، ایسی عبادت جو تمام نفلی عبادتوں سے افضل ہے اور جس کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ؎

زتسبیح و سجادہ و دلق نیست
طریقت بجز خدمت خلق نیست

طریقت یعنی تصوف تسبیح، جانماز اور گدڑی سے حاصل نہیں ہوتا، تصوف خدمت خلق کے بغیر نامکمل ہے۔

لہٰذا جن اللہ کے بندوں کو اس مفت کے اختیاری عہدے کی لذت اور اس کے مفادات کا صحیح ادراک حاصل تھا وہ دنیا کے معروف عہدوں میں سے خواہ کتنے اونچے عہدے پر پہنچ گئے ہوں، لیکن کسی حالت میں انہوں نے خادم کا یہ اختیاری عہدہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم تھے، اور انہیں مفتی اعظم ہند کا نام دیا جاتا تھا، ان کے لکھے ہوئے فتاویٰ کا انتخاب دس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے اور ابھی تک نامکمل ہے، لیکن ان کا روزانہ کا معمول یہ

تھا کہ صبح کو دفتر جانے سے پہلے اپنے محلے کی بیوہ خواتین کے گھر جاتے، ان کا حال معلوم کرتے اوران سے پوچھتے کہ اگر آپ کو بازار سے سودا منگوانا ہوتو بتادیجئے، وہ خواتین مولانا کو اپنی ضروریات بتاتیں، اور مولانا خود بازار جاکر ان کا سودا سلف لاتے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی خاتون کہتی کہ مفتی صاحب! یہ چیز تو آپ غلط لے آئے۔ میں نے فلاں چیز منگوائی تھی، مفتی صاحب یہ سن کر دوبارہ بازار جاتے اور غلطی کی تلافی فرماتے۔

مفتی صاحب کے بہت سے شاگرد تھے، اور وہ یہ کام خود کرنے کے بجائے اپنے شاگردوں سے بھی کراسکتے تھے، لیکن ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ نبی کریم ﷺ اور خلفاء راشدین کی سنت ہے، وہ حضرات دونوں جہاں کے اتنے بڑے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود اپنے ہاتھوں سے لوگوں کی خدمت کرتے تھے، اس لئے خدمت خلق کی یہ لذت اوراس کا اجروثواب میں خود براہ راست کیوں حاصل نہ کروں؟

یہ تھا خادم کا وہ اختیاری منصب جوان حضرات نے دوسرا بڑے سے بڑا اعزاز ملنے کے بعد بھی نہیں چھوڑا غور فرمائیے کہ اگر ہم میں سے ہر شخص اپنے عام غیر اختیاری عہدوں کے ساتھ ساتھ یہ مفتی کا اختیاری عہدہ بھی حاصل کرلے اور اسے مستقل سنبھالے رکھے تو معاشرے کے کتنے زخم بھر جائیں! ہم اگر دوسروں کا سامان نہ اٹھائیں ان کے گھر میں پانی نہ بھریں، اور بیواؤں کا سودا سلف خود اپنے ہاتھوں سے نہ لائیں، تو کم از کم اتنا ہی کرلیں کہ جب ان میں سے کوئی شخص ہم سے ہمارے فرائض منصبی میں سے کسی کام کا مطالبہ کرے اس کا کام ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ کردیں۔

☆☆☆

مبلغ اسلام
حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ [1]

انسان زمین پر خدا کا خلیفہ (نائب) ہے اس کے فکر وشعور کا بہترین مصرف عرفان ذات وخدا کی معرفت ہے، اسی معرفت کی بنیاد پر اس کو ''خلافت ارضی'' کا خطاب ملا ہے، بیش روا انبیاء کرام، پیشوائے انبیاء سرور دوعالمؐ اور تمام امم سابقہ اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی دعوت تبلیغ اور تمام تر جدوجہد کا ماحصل دولت ایمان سے انسان کو سرفراز کرنا تھا جن کو یہ دولت ملی انہوں نے اس کو اپنے ابنائے جنس میں عام کرنا چاہا چنانچہ صحابہ کرامؓ کے بعد سے لے کر اب تک ہر دور میں بے شمار خوش نصیب انسانوں نے اس دولت سے سرفرازی حاصل کی ہے۔جن نفوس قدسیہ کو یہ دولت بدرجۂ کمال ملی انہوں نے اس کو عام کرنا چاہا، اس سلسلے میں انہوں نے انتھک محنتیں کیں اور جان ومال کی قربانیاں دی ہیں۔دراصل خدا کی یافت اور اس کی معرفت اوراس کے عطا کردہ نظام حیات کی برتری کا عقیدہ وہ انمول دولت ہے کہ جس کو بھی یہ دولت مل جائے وہ کبھی چین سے بیٹھ نہیں سکتا وہ یقیناً اس بے بہا دولت کو

[1] حضرت مولانا بدیع الزماں صاحب ندوی قاسمی، روزنامہ سالار 25/دسمبر-2009ء

باٹنے اور اس لازوال خزینے سے ناواقفوں کو آشنا کرنے کے لئے بے قرار ہوگا۔ چنانچہ تمام نبیوں کا یہی حال رہا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اپنی پوری زندگی اسی بے چینی میں گزاری ہے، بلکہ سلف سے خلف تک ان تمام اہل ایمان کی یہ کیفیت رہی ہے جو کمال یقین سے بہرہ ور تھے وہ گمرہی میں پڑے ہوئے انسانوں کو راہ ہدایت پر لانے کے لئے تڑپتے اور مچلتے رہے، انہوں نے تمام انسانوں کے لئے اس دولت کے عام کئے جانے کی دعائیں مانگی ہیں اور رو رو کر اپنے جی کو ہلکان (نیم جان) کیا ہے۔

بانی تبلیغی تحریک کے بارے میں اکابر علماء کے تاثرات

مناظر اسلام، نامور عالم دین، نمونہ اسلاف اور مشہور صاحب قلم حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کہتے ہیں۔ ''ہم اور ہمارے بعض صاحب بصیرت اس بارے میں ہم خیال و یک زبان تھے کہ اس زمانے میں یہی شخصیت (مولانا الیاس) اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی اور رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ہے، جن کو دین کے موثر اور زندہ جاوید ہونے کے ثبوت کے طور پر اور صحابہ کرام کے عشق اور خیر القرون کے دینی جنون و بے قراری اور اس دور کی خصوصیات کا ایک اندازہ کرنے کے لئے اس زمانے میں ظاہر کیا گیا ہے''۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی شخصیت ایک آیۃ اللہ تھی اور زندہ معجزہ اور حضرات صحابہ و تابعین کے جذب دوراں کا ایک مکمل پرتو، دراصل اس شان امتیاز کا باعث وہی دولت ایمان تھا جس کا پانے والا ساغر توحید سے سرشار ہوتا ہے اور ساری انسانی دنیا کا غمخوار! جس کے رگ و پے میں قوت و عمل کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ اسباب کے پردوں سے پرے تجلیات حق کا مشاہدہ بن جاتا ہے۔ عالم اسلام کی تاریخ ساز ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (حضرت مولانا میاں ندویؒ) اپنی کتاب ''قد پستہ جسم نہایت نحیف'' ''مگر

اس نحیف و نزار جسم کی تاب و توانائی کا کیا حال تھا؟....'' ''نہایت چاق و چست، سستی کا نام و نشان نہیں تھا۔ زبان میں کھ کنے لیکن آواز میں قوت اور گفتگو میں جوش اور اس جوش سے اکثر گفتگو کا سیل راواں لکنت کی رکاوٹوں سے ٹکرا کر ایک آبشار کی صورت اختیار کر لیتا تھا''۔ شاید وہ مادر زاد ''ولی'' تھے جبھی تو گھر کی ایک رابعہ سیرت خاتون ''بی امۃ الرحمٰن''، جس کے عابدہ، زاہدہ ہونے کا چرچا گھر کے باہر بھی تھا کہتی تھیں: ''اختر! مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے'' اور کبھی حیرت و استعجاب کیساتھ اپنا یہ کشفی مشاہدہ بیان کرتی تھیں کیا بات ہے؟ کہ تیرے ساتھ مجھے صحابہ کی سی صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ (حضرت مولانا الیاس اور ان کی دینی دعوت: ص، 42)

کم سنی کا یہ رگ جوانی میں اور نکھرا اور خوب نمایاں ہوا تو ایک دیدہ ور عالم شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کی فراست ایمانی نے اپنا یہ تاثر بیان کیا کہ ''میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہ یاد آجاتے ہیں۔ (حوالہ مذکور) مولانا محمد منظور نعمانیؒ کہتے ہیں مجھے یہ کہنے میں کوئی مبالغہ محسوس نہیں ہوتا کہ ''مولانا چودھویں صدی میں قرن اول کے خزانہ عامرہ کا ایک ''موتی'' تھے۔ (حوالہ مذکورہ، ص:30)

بانی تبلیغ ایک جید عالم اور مرشد وقت بھی تھے

یہاں بانی تبلیغ کے سلسلے میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ وہ ایک جید عالم بھی تھے، انہوں نے اسلامی علوم و فنون میں خوب مہارت حاصل کی تھی اور کمال مہارت کیساتھ عالم اسلام کی مشہور دینی درسگاہ مظاہر علوم سہارنپور میں تعلیم و تدریس کا فریضہ بھی انجام دیا تھا وہ ایک مرشد طریق بھی تھے، انہوں نے مجاہدہ و ریاضت کے ذریعہ احوال و مقامات کی گھاٹیوں کو طے کیا تھا اور سلوک و معرفت کی بلندیوں تک رسائی بھی حاصل کی تھی۔

تبلیغی تحریک کے آغاز کا پس منظر

1344ھ میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا سفر حرمین ان کی دینی خدمات کے میدان میں ایک نیا موڑ ثابت ہوا، اسی سفر میں قیام مدینہ منورہ کے موقع پر مولانا کی عجیب حالت تھی، رفقائے سفر نے مولانا کو عجیب بے چینی اور اضطراب میں پایا، آپ کسی طرح مدینہ منورہ سے جدا ہونے پر راضی نہ تھے''۔

مولانا کے ایک ممتاز رفیق سفر حضرت مولانا خلیل احمدؒ نے صورت حال کا مشاہدہ کر کے رفقاء سفر سے کہا: ''تم ان سے چلنے کے لئے اصرار نہ کرو، ان پر ایک حالت طاری ہے: یہ حالت کیوں طاری ہوئی؟ خود مولانا کہتے ہیں: ''مدینہ منورہ کے اس قیام کے دوران مجھے اس کام تبلیغ کے لئے امر ہوا، اور ارشاد ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے کچھ دن میرے اس بے چینی میں گزرے کہ میں ناتواں کیا کر سکوں گا؟ کسی عارف سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ''پریشانی کی کیا بات ہے یہ تو نہیں کہا گیا ہے کہ تم کام کرو گے، یہ کہا گیا ہے کہ ہم تم سے کام لیں گے پس کام لینے والے کام لے لیں گے'' یہ امر کسی صورت میں ہوا؟ فرمایا:

تبلیغ کا طریقہ مجھ کو خواب میں منکشف ہوا، بلکہ خواب جو نبوت کا چالیسواں حصہ ہے مولانا پر علوم و معارف کے فیضان کا ایک ذریعہ تھا، فرمایا کہ: آج کل خواب میں مجھ پر علوم صحیحہ کا القاء ہوتا ہے۔ (حوالہ مذکور)

تبلیغی تحریک کی ابتداء

غرض اس مرد باخدا نے سفر حج سے واپسی کے بعد 1345ھ مطابق 1927ء میں اپنی دینی خدمات کے سلسلے کو آہستہ آہستہ ایک نیا رخ دیا اور

تبلیغی گشت، تبلیغ کے لئے فراغت وقت اور نقل و حرکت کا وہ نظام کار منظم کیا جو آج ''تبلیغ'' کہلاتا ہے۔

تبلیغی فارمولہ حکیم الاسلام کی نظر میں

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کہتے ہیں کہ: ''تبلیغی فارمولا کسی عقلی سوچ بچار سے نہیں بنایا گیا ہے، بلکہ معرفت حق اور الہام غیب سے پیدا شدہ ہے اور عارفین کے قلب سے جو چیز نکلتی ہے اس میں معرفت اور نوارنیت کی شان ہوتی ہے''۔ اس کام کی صداقت اور نوارنیت کا یہ کھلا ثبوت ہے کہ یہ کام جہاں بھی گیا کامیاب رہا، چنانچہ آج دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی درجے میں اس نورانی کام کی کرنیں پھیلی ہوئی نہ ہوں۔

تبلیغی فارمولہ دوررس نتائج کا حامل ہے

بظاہر ''تبلیغی کام'' نہایت سیدھا سادا ہے، کلمہ، نماز، علم و ذکر، اکرام مسلم، اخلاص نیت اور تفریغ وقت کے چھ نکاتی فارمولے پر مشتمل ہے لیکن درحقیقت یہ فارمولہ گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے بڑے دوررس نتائج کا حامل ہے، اگرچہ اس کام کا مشاہدہ کرنے والے بعض حضرات کو یہ کام نہایت سیدھا سادا اور دین کے چند گنے چنے امور کا ترجمان اور مبلغ نظر آتا ہے، حتی کہ بعضوں نے اس کو ''کلمہ کی تحریک'' سمجھا اور چراغ پا ہو گئے کہ کلمہ گو مسلمانوں کو کلمہ سکھانا اور ان سے کلمہ طیبہ پڑھوانا ان کی اہانت اور بے توقیری ہے۔ بعضوں نے اس کو نماز کی تحریک سمجھ لیا ہے لیکن بانی تحریک کہتے ہیں۔ میرا مدعا کوئی پاتا نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تو ''تحریک صلوۃ'' ہے میں قسم سے کہتا ہوں کہ ہرگز تحریک صلوۃ نہیں۔

تبلیغی تحریک کا مقصد

تو پھر اس تحریک کا مقصد کیا ہے؟ مولانا کہتے ہیں ''ہماری اس تحریک کا اصل مقصد ہے جمیع ماجاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' سیکھنا یعنی اسلام ک پورے علمی وعملی نظام سے امت کوابستہ کردینا ہے''۔

مولانا کے الفاظ میں ''ہماری تحریک کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے سارے جذبات پر دین کے جذبے کو غالب کرکے اور اس راستے مقصد کی وحدت پیدا کرکے اور اکرام مسلمین کے اصول کو رواج دے کر پوری قوم کو اس حدیث کا مصداق بنایا جائے۔''**المسلمون کجسد واحد**''۔

مولانا کا ایک دوسرا ارشاد تحریک کے نصب العین اور بنیادی لائحہ عمل کی واضح ترجمانی کرتا ہے ''ہماری تحریک کا اصل مقصد ''طاغوت'' سے ہٹنا اور ''اللہ'' کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ بدون قربانی کے نہیں ہوسکتا، دین میں جان کی بھی قربانی ہے مال کی بھی، تبلیغ میں جان کی قربانی یہ ہے کہ اللہ کے واسطے اپنے وطن کو چھوڑے اور اللہ کے کلمہ طیبہ کو پھیلائے، دین کی اشاعت کرے، مال کی قربانی یہ ہے کہ سفر تبلیغ کا خرچ خود برداشت کرے، جان ومال کی قربانی کا یہ نظم تحریک کی جان اور اس کا خلاصہ ہے اور اس سلسلہ میں کوتاہی عذاب الٰہی کو دعوت دینا ہے!

بانی تبلیغ کی ان تصریحات کی روشنی میں اس تحریک کا موجودہ فارمولہ یا زیر عمل منصوبہ خود انہیں کے الفاظ میں یہ ''تبلیغ کی ابجد ہے پوری تبلیغ نہیں''، جس کی توضیح حکیم الاسلام کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''یہ تبلیغ درحقیقت تعلیم دین کا ایک مقدمہ ہے جسے وضو نماز کے لئے ایک لازمی وسیلہ ہے''۔

راہ خدا میں ذلیل ہونا ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتا ہے؟

چونکہ مولانا کی اس تحریک میں زیادہ تر زور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالنے پر ہوتا ہے لیکن عموماً لوگ اس کیلئے آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے ہیں، بلکہ اس مطالبے کا ان پر ابتدائی ردعمل بڑا سخت ہوتا ہے، مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ذلت ورسوائی کے کٹھن مرحلے بھی درپیش ہوتے ہیں، لہٰذا مولانا کی یہ تاکید ہے کہ ''ہمارے کارکن اس بات کو مضبوطی سے یاد رکھیں کہ اگر ان کی دعوت وتبلیغ کہیں قبول نہ کی جائے اور الٹا انکو برا بھلا کہا جائے، الزامات لگائے جائیں تو وہ مایوس اور ملول نہ ہوں اور ایسے موقع پر یہ یاد کرلیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام اور بالخصوص سید الانبیاء ﷺ کی خاص سنت اور وراثت ہے راہ خدا میں ذلیل ہونا ہر ایک کو کہاں نصیب ہوتا ہے؟

مختلف طرز فکر اور طریقِ کار رکھنے والوں کا اعتراف

مولانا کے چلائے ہوئے کام اور تحریک کی صداقت وحقانیت اور اس کی اثر اندازی اور کرشمہ سازی کا یہ کھلا ثبوت ہے کہ مختلف مزاج اور طرز فکر حتی کہ خدمت دین کے سلسلے میں اپنا ایک مختلف طریق کار رکھنے والوں نے بھی جب اس کام کو قریب سے دیکھا اور انہیں اس کے نتائج وثمرات کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملا تو انہوں نے اپنی ذہنی ساخت سے ہٹ کر اور افتادِ طبع سے بالاتر ہوکر کھلے دن سے اس کام کی اہمیت عظمت اور افادیت کا اعتراف کیا ہے، چنانچہ حکیم الامت مجدد الملّت ،قطب عالم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کام کی نوعیت، حقیقت اور اس کے عمومی نتائج اور اثرات کو معلوم کرکے ارشاد فرمایا ''مولانا الیاس نے یاس کو آس میں بدل دیا'' مجلس احرار کے ممتاز رہنما اور تحریک ختم نبوت کے قائد حضرت مولانا

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے جلوے میں واقع مرکز تبلیغ میں پہنچ کر اور بانی تبلیغ کی شخصیت اور ان کی ایمانی واحسانی انوار وتجلیات کا بنگاہ بصیرت مشاہدہ کر کے فرمایا ''میں یہ سمجھتا تھا کہ نظام الدین اولیاء ختم ہو گئے۔ مگر میں نے بستی نظام الدین میں آ کر دیکھا کہ نظام الدین اولیاء ابھی زندہ ہیں۔ وہاں جا کر میں دوبارہ مسلمان ہوا ہوں جس کو بھی مسلمان بننا ہے وہاں جائے۔ بانی جماعت اسلامی اور برصغیر ہندو پاک کی نامور عبقری شخصیت حضرت مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ نے کہا تھا ''حقیقتاً اس نوعیت کی تحریک ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں یا تو حضرت شیخ احمد مجدد سرہندیؒ نے اٹھائی تھی یا حضرت سید احمد بریلوی نے اس کا احیاء کیا یا اب مولانا محمد الیاس کو اللہ تعالیٰ نے اسے تازہ کرنے کی توفیق بخشی ہے، جہاں تک عوام میں کام کرنے کا تعلق ہے میرے نزدیک وہ طریقہ عمل سب سے بہتر ہے اور انبیاء کے طریق عمل سے شبہ ہے جس سے ''مولانا محمد الیاس صاحبؒ'' نے کام لیا ہے۔ عالم اسلام کے مشہور محدث صاحب فضائل اعمال، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ''عنایت الٰہی اس تحریک کی طرف متوجہ ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا ''تبلیغی تحریک'' موجودہ دور میں ایک پھلتی، پھولتی اور تیزی سے پھیلتی ہوئی تحریک ہے۔ مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحبؒ نے فرمایا: ''تبلیغ کا ماحصل دین سیکھنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے''۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند نے کہا ''تبلیغ کی سچی روح جماعت تبلیغ میں کارفرما ہے''۔ مناظر اسلام حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ فرماتے ہیں: ''تبلیغی جماعت اصل دین کی داعی ہے'' حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ فرماتے ہیں ''آج کی سب سے زیادہ مقبول اور وسیع تحریک وہ ہے جسے عموماً تبلیغی جماعت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ تحریک جس کے اب تک نہ عہدیدار چنے گئے ہیں، نہ کوئی

دفتر ہے نہ اپنی اشاعت کے لئے اس کا کوئی نقیب جریدہ ہے اور آج کی دنیا میں کسی بھی تنظیم کو چلانے کے لئے جو رسمی چیزیں لازمی سمجھی جاتی ہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے''۔ مفکر اسلام گرامی قدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ فرماتے ہیں: ''حقیقت میں اس پورے نظام دعوت وتعلیم میں بڑی ترقی وتنظیم کی گنجائش ہے اور اس میں زمانہ کے ساتھ چلنے اور مخالف دینی تحریکات اور دعوتوں کا مقابلہ کرنے اور عوام کے لئے ان کا بدل بننے کی بہترین صلاحیت ہے۔'' حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صراحت کے مطابق: ''موجودہ ہندوستان کی تمام دینی تحریکوں میں اصل اول سے زیادہ قریب ہے''۔

درحقیقت یہ طریقہ کار جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ مولانا محمد الیاس پر کھولا تھا اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہو رہے ہیں، بلا مبالغہ لاکھوں لوگ جو نہایت غلط قسم کی زندگی میں پڑے ہوئے تھے انہوں نے اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدل ڈالیں، ہزاروں ایسے لوگ جو اجتماع، چلہ اور گشت کا مذاق اڑاتے تھے جب ان کو ان کے ماحول سے نکال کر دینی فضاؤں میں رکھا گیا، وہاں ان کے اوپر تبلیغ کی گئی تو وہ اس پر فریفتہ ہو گئے، درحقیقت آج دنیا میں خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے راہ نجات اور فلاح وکامرانی کی راہ یہی دعوتی کام ہے ان تمام حقائق کے پیش نظر اس تحریک کے ساتھ کم از کم مثبت رویہ اپنانا فروغ دین کے کام آتا ہے۔

تبلیغی تحریک پر نصرت الٰہی کا فیضان

بانی تحریک حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے انتقال کو پینسٹھ اور اس تحریک کو شروع ہوئے بیاسی سال کا عرصہ ہو رہا ہے اس عرصہ میں اس کام کو امت کے درمیان غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اس پر مسلسل نصرت الٰہی کا فیضان

ہو رہا ہے، یورپ اور امریکہ جیسے براعظموں میں لوگ اس جماعت سے روشناس ہو چکے ہیں اور اسکے کام اور پروگرام کو اپنا رہے ہیں اور دین سے براہ راست تعلق پیدا کرنے اور صحیح اسلامی زندگی کو عملی طور پر بروکار لانے کے لئے اس جماعت کو ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں، 1345ھ مطابق 1927ء میں باضابطہ تبلیغی جماعت کا آغاز نئی دہلی کی اس بستی ''بنگلہ والی مسجد'' سے ہوا تھا جو سلطان المشائخ محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے نام سے موسوم ہے۔

تبلیغی تحریک کے حیرت انگیز نتائج کا ایک دلفریب منظر

اس میں کوئی شک نہیں کہ تبلیغی تحریک کی محنتوں کے حیرت انگیز نتائج پوری دنیا میں برآمد ہو رہے ہیں، بلا مبالغہ لاکھوں لوگ جو نہایت غلط قسم کی زندگی میں پڑے ہوئے تھے انہوں نے اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدلڈالیں، داڑھی کے بغیر نکلے، داڑھی والے ہو کر لوٹے، سوٹ ٹائی میں نکلے اور واپس آئے تو ان کا لباس پائجامہ کرتہ ہو گیا تھا۔ بے نمازی، زکوٰۃ نہ دینے، جھگڑے کرنے والے اور بدکاریوں میں لت پت نکلے اور واپسی اس حالت میں ہوئی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ وہی شخص ہے؟

اصولوں کی پابندی میں اس تحریک کی کامیابی کی ضمانت ہے

انشاءاللہ یہ کام اپنی تمام تر برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ اتمام کو پہنچ کر رہے گا۔ بانی تحریک کی صراحت کے مطابق ''شرط یہ ہے کہ اس کے وعدہ نصرت پر کامل یقین اور بھروسہ کے ساتھ اس سے نصرت مانگتے رہو، اور اپنی امکانی کوششوں میں کوئی کمی نہ کرو'' بانی تحریک کی یہ بھی تاکید ہے کہ دوستو! اس تبلیغ میں اصولوں کی پابندی نہایت ضروری ہے کہ اگر کسی اصول میں ذرا بھی کوتاہی کرو گے تو خدا کا وہ عذاب جو شاید

بد پر آئے فوراً ہی تمہارے سر پر آموجود ہوگا'' اصولوں کی پابندی اور ان کی رعایت ہی میں اس کام کی کامیابی کی ضمانت ہے مگر اس کے لئے اہل علم کا تعاون نہایت ضروری ہے کیونکہ بقول حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ علماء ہی اس کام کے اصولوں کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اصولوں کو کب کس طرح آگے پیچھے کرنا چاہئے۔'' اسی لئے بانی تحریک نے علماء کو اس تحریک سے قریب ہونے اور ممکنہ حد تک ان کو حصہ لینے کی ترغیب دی ہے۔ چنانچہ انتقال سے پہلے بڑی دلسوزی سے بانی تحریک نے فرمایا: ''کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے''۔

تبلیغی اجتماعات کے اغراض ومقاصد

ہمارے دنیوی اعمال دینی ہو جائیں اور دینی اعمال سطحیت کے بجائے حقیقت اختیار کر لے اس مقصد کو بروئے کار لانے اور اس کو تقویت پہنچانے اور عملی زندگی میں نشاط پیدا کرنے کے لئے چھوٹے اجتماعات اور درس وتعلیم کے سلسلوں کے بڑے اجتماعات منعقد کرنا اور ان کو کامیاب بنانے کے لئے محنت وکوشش کرنا بہت مفید ہے، اس لئے جماعت کی شاخوں کی طرف سے مختلف شہروں میں عموماً بڑے اجتماعات مقرر کئے جاتے ہیں جہاں جماعت سے تعلق رکھنے والے حضرات جمع ہوتے ہیں اور بہت سے نئے لوگ اس کام سے متعارف اور قریب ہوتے ہیں، اس کے علاوہ ان اجتماعات کا ایک فائدہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ چند دنوں تک ایک خالص دینی فضا اور ماحول قائم ہو جاتا ہے اور ایسی اسلامی اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے جہاں عموماً ہر شخص دینی جذبہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے جذبہ کے ساتھ جمع ہوتا ہے اور زندگی کے صحیح نقشوں پر محنت کرنے کا طریقہ سیکھتا ہے شہر بنگلور کے اطراف واکناف 26/دسمبر 2009ء تا 13/فروری 2010ء مختلف مقامات پر مختلف تاریخوں میں چھ انتہائی اہم اجتماعات

ہورہے ہیں،ان اجتماعات میں سینکڑوں جماعتیں ملک اور بیرون ملک میں اخلاقی اورروحانی دعوت کے لئے روانہ کی جائیں گی، جوکئی کئی مہینہ محلّہ محلّہ،شہرشہرگشت کرکے ایک ایک شخص پرجاکرایمان باللہ اورایمان بالآخرت کی فضاپیدا کرنے کے لئے جان توڑکوشش کریں گی۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بانی تبلیغی تحریک حضرت مولانا شاہ محمد الیاسؒ (مدت امارت 1927 تا 1944ء ۔ جملہ 17 سال) کے ظلمتوں میں ایک دیا جلایا ،امیر و حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ (مدت امارت 1944 تا1965/جملہ 21 سال) نے اس کی لوکو بڑھایا، امیرسوم حضرت جی مولانا انعام الحسنؒ (مدت امارت: 1965 تا 1995ء جملہ 30 سال) کے تیس سالہ اوران کے بعد مجلس شوریٰ (مدت: 1995 تا حال) کے چودہ سالہ اور جملہ بیاسی سال کی مدت میں اس نے آفتاب عالم تاب کی طرح عالم کے عالم کوروشن کردیا۔ ناچیز کا مقصداس مضمون کی اشاعت سے کام کی تشہیرنہیں ، بلکہ شہر بنگلور کے اطراف واکناف میں منعقدہونے والے چھ اہم اجتماعات کے موقع پر قارئین کی خدمت میں اس تحریک کی صداقت ،معقولیت، حقیقت اورعنداللہ مقبولیت کا اظہار ہے۔

☆☆☆

مفسرقرآن مولانا عبدالماجددریا آبادیؒ [11]

مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی ہمہ صفات شخصیت نہ صرف اردو ادب وصحافت بلکہ پوری ملت اسلامیہ کیلئے سرمایۂ صدافتخار ہے۔مولانا کی فکرانگیز تحریریں سالہا سال تک اردوعوام وخواص کے ذہنوں پر چھائی رہیں ان کا شمار مولانا ابوالکلام آزاد،مولانا حسرت موہانی ،مولانا محمد علی جوہراور مولانا ظفرعلی خاں جیسی تاریخ ساز علمی ،ادبی اور صحافتی شخصیتوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بیسویں صدی کی فیصلہ کن تحریک آزادی میں اپنے قلم سے تلوار کا کام لے کرسرزمین وطن پرآزادی اورحریت فکر کے پرچم لہرائے ۔مولانا عبدالماجددریا آبادی کس پائے کے صحافی وقلمکار تھے اس کا اندازہ اردو کے ممتاز دانشور جناب مالک رام کے ان الفاظ سے بآسانی ہوتا ہے:''اس میں شبہ نہیں کہ وہ (مولانا عبدالماجددریا آبادی) صاحب طرز نثر نگار ہیں خصوصاً طنزاور پھبتی میں ان کا جواب نہیں،انہوں نے سیاسی اور مذہبی قسم کے حددرجہ سنجیدہ اورخشک موضوعات پر بھی لکھا ہے،لیکن کسی موقع پر شگفتگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ادبی چاشنی ہرجگہ موجود ہے ،ان کے پائے کے انشاء پرداز ہماری زبان کو بہت کم نصیب ہوئے''۔(تذکرۂ معاشرین،جلد۴)

[11] تلخیص: تذکرہ معاصرین،از مالک رام،نقوش لاہورآپ بیتی نمبر1965

اور یہ بھی ایک ادبی سچائی ہے کہ برصغیر کے علمائے کرام اور اسلامی دانشوروں میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی شخصیت کئی طرح سے انفرادی شان کی حامل ہے۔ ان کا شمار قرآن کریم کے اہم مفسرین اور اسلامی علوم کے جید علماء میں ہوتا ہے لیکن انہوں نے اسلامی مدارس کی روایتی تعلیم حاصل نہیں کی۔ مولانا عربی، فارسی اور اردو کے ہی قلمکار نہیں تھے بلکہ انہوں نے انگریزی زبان میں بھی ہندوستان اور مغربی دنیا کے بڑے اخبارات میں مضامین ومراسلات لکھے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں قرآن کریم کی تفسیر لکھ کر عالم اسلام میں اپنی عبقریت ثابت کی۔ ان کا شمار مغربی ادب وفلسفہ کے ماہرین میں ہوا اور علوم شرقیہ کے ممتاز دانشوروں میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا۔ مولانا اپنے عہد کے نامور خطیب اور داعی اسلام ہونے کے ساتھ ساتھ ایک شگفتہ بیان شاعر بھی تھے۔ ان کی غزلیہ شاعری میں وہ ساری رنگینی، شوخی اور نغمگی موجود ہے جو اس عہد کی لکھنوی شاعری کی شناخت ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام 'تغزل ماجدی' اردو کے کلاسیکی شعری سرمائے میں نمایاں اضافہ تسلیم کیا گیا۔ ایک صاحب طرز نثر نگار اور انشا پرداز کی حیثیت سے مولانا کی تحریریں اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن مولانا کی علمی، فکری اور تخلیقی ہمہ جہتی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ 1925ء سے زائد عرصہ تک اپنے مشہور زمانہ اخبار 'سچ'، 'صدق جدید' کے صفحات پر عالم اسلام کے ملی، مذہبی اور سیاسی مسائل پر اپنے حق نگار، بے باک اور دھار دار قلم سے جو فکری انقلاب برپا کئے اردو تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ایک اور خصوصیت انہیں روایتی علماء اور ماہرین اسلامیات سے الگ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ مولانا مغربی زبان وادب اور فکر وفلسفہ کے سمندر میں ڈوبے تو مذہب سے بیگانہ ہوکر ایسی تحریریں ان کے قلم سے نکلیں جن کی وجہ ان پر کفر کے فتوے بھی لگے اور ان کی ذات ملت اسلامیہ کے لئے موجبِ طعن وتعریض قرار پائی لیکن

پھر تشکیک وانکار کے اندھیروں میں حق وصداقت کی روشنی ملی تو جادۂ مستقیم پر چلتے ہوئے اقدار اسلامی کے عظیم موئید، مبلغ، داعی اور وکیل بن کر منزل عروج تک پہنچے۔ اسلامیات اور اردو ادب میں مولانا جیسی کوئی اور شخصیت نہیں ہے جس کی علمی، فکری اور شخصی زندگی ایسے نشیب وفراز سے گزری ہو۔

عبدالماجد دریا آبادی لکھنو سے ۴۰ میل کے فاصلے پر واقع ضلع بارہ بنکی کے چھوٹے سے تاریخی قصبے دریاباد کے ایک معزز علمی وروحانی گھرانے میں یکم مارچ 1892ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالقادر صاحب انگریزی حکومت میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ ایک خدا رسیدہ بزرگ حضرت شیخ محمد مخدوم آب کش رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ اس رعایت سے مولانا دریا آبادی کے خاندان کا نام مخدوم زادگان ہے۔ مشہور ہے کہ حضرت شیخ محمدؒ کنویں سے پانی نکال نکال کر لوگوں کو پلاتے اور نمازیوں کو وضو کراتے تھے، اس سے ان کا لقب آب کش پڑ گیا، آپ کا مزار دریا آباد میں مرجعِ خلائق ہے۔

جناب مالک رام نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی خودنوشت اور پھوکن لعل کی تالیف 'تاریخ دریاباد' نیز دوسرے معتبر حوالوں سے لکھا ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے دادا مفتی مظہر کریم 1857ء کے زمانہ میں حضرت علامہ فضل حق خیر آبادیؒ کے ساتھی تھے جنہوں نے دہلی کی جامع مسجد میں 300 سے زائد علمائے کرام کے اجتماع میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا تاریخ ساز فتویٰ جاری کیا تھا۔ جنگ آزادی میں ہندوستانی مجاہدین کی ناکامی کے بعد گرفتار ہوکر انڈمان میں قید کئے جانے والوں میں علامہ فضل حق کے ساتھ مفتی عبدالکریم بھی تھے۔ زمانۂ قید فرنگ میں ہر قیدی سے اس کی استعداد کے مطابق مشقت لی جاتی تھی۔ مفتی صاحب کو لکھنے پڑھنے کے کام میں لگایا گیا۔ اس دوران انہوں نے علم جغرافیہ کی مشہور عربی کتاب 'مراصد الاطلاع'

کا اردو ترجمہ مکمل کر دیا، ان کی لیاقت اور علمی مرتبے کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے انہیں پونے سات برس کی قید کے بعد 1865ء میں رہا کر دیا۔ ان کا انتقال 1872ء میں دریا آباد میں ہوا۔ مفتی صاحب کے دو بیٹے تھے عبدالرحیم اور عبدالقادر تھے۔ عبد الرحیم جونپور کی کلکٹری میں نقل نویس تھے۔ انہیں علم وادیب سے دلچسپی تھی اور وہ اچھے خاصے مزاح نگار تھے، فارسی وعربی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ انہیں دوائیں بنا کر مفت تقسیم کرنے کا شوق تھا، ان کی دواؤں سے بہت سے مریض صحت یاب ہوئے۔ ان کا انتقال 1893ء میں ہوا۔ مفتی صاحب کے چھوٹے بیٹے عبدالقادر غیر معمولی صفات کے مالک ثابت ہوئے۔ ان کی ولادت 1848ء میں ہوئی تھی۔ اس دور کے رواج کے مطابق ان کی تعلیم عربی وفارسی سے شروع ہوئی، انہوں نے فرنگی محل کے تاریخی مدرسے سے عربی، فارسی اردو اور دینی علوم کی تربیت مکمل کی لیکن اس کے ساتھ ہی انگریزی زبان میں پرائیویٹ امتحانات پاس کئے، یہاں تک کہ وکالت کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔ انہوں نے اپنا کیریئر ایک وکیل کے طور پر شروع کیا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس پیشے میں قدم قدم پر جھوٹ اور فریب سے کام پڑتا ہے تو انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور عربی، فارسی کے معلم بن گئے، لکھنو میں ان کی علمی لیاقت بہت شہرہ ہوا، بہت سے انگریز افسران بھی ان سے عربی فارسی پڑھنے آتے تھے۔ ان کی قابلیت اور ذہانت کو دیکھتے ہوئے برطانوی حکام نے انہیں عدلیہ میں ملازمت دے دی جہاں وہ اپنی ذہانت اور صلاحیت سے ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔ ان کی شادی ان کے بڑے چچا مولوی نور کریم کی صاحبزادی نصیرالنساء سے ہوئی تھی۔ ان کے دو بیٹے عبدالمجید اور عبدالماجد اور ایک دختر تھی، عبدالمجید نے اعلیٰ تعلیم پائی اور وہ بھی پہلے تحصیل دار اور پھر 1923ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے وہ 1942ء میں ریٹائر ہوئے، 1960 میں ان کا انتقال ہوا۔

عبدالمجید صاحب کو بھی علم وادب کا ذوق تھا۔ انہوں نے ریاستی حکومت کی سالانہ اطلاعاتی انگریزی کتاب کا دوبار اردو ترجمہ کیا، ان کے چھوٹے بھائی عبد الماجد تھے، یہی مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام سے پورے ملک، اسلامی دنیا اور اردو ادب وصحافت میں عظیم الشان شہرت کے مالک ہوئے۔ مولانا عبد الماجد دریا آبادی نے فرنگی محل کے معروف عالم ومولانا عظمت اللہ سے عربی وفارسی ادبیات واسلامیات کی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد انہوں 1908ء میں سیتاپور ہائی اسکول سے انٹرنس پاس کیا، اس کے بعد کیننگ کالج لکھنو میں داخلہ لیا۔ 1911ء میں بی اے کی سند حاصل کی۔ انہیں فلاسفی کے سبجیکٹ میں خاص دلچسپی تھی، اس لئے ایم اے فلسفہ کے لئے علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں ایم اے او کالج الہٰ آباد یونیورسٹی سے ملحق تھا کیونکہ اس وقت تک یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی تھی جس کے لئے سرسید اور ان کے رفقاء جدوجہد کر رہے تھے۔ ایم اے سال اول امتحان الہٰ آباد یونیورسٹی میں دیا لیکن بدقسمتی سے فیل ہو گئے۔ اسکے بعد وہ دہلی جا کر سینسٹ اسٹیفین کالج میں داخل ہو گئے، اسی دوران والد صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حالات کچھ اس طرح بدلے کہ سلسلۂ تعلیم جاری نہ رہ سکا۔ والد کے انتقال کے بعد بھی شاید وہ کالج کی تعلیم جاری رکھتے لیکن ایک اور حادثہ یہ ہوا کہ ان کی خاصی بڑی رقم لاہور کے پیپلز بینک میں جمع تھی، اچانک وہ بینک دیوالیہ ہو کر بند ہو گیا۔ ان کا اثاثہ ڈوب گیا، مجبوراً کالج چھوڑ کر لکھنو آ گئے۔

مولانا دریا آبادی کو مطالعہ کا شروع سے بیحد شوق تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں جو کچھ سامنے آیا پڑھ ڈالا۔ اس شوق نے انہیں انگریزی، اردو، عربی اور فارسی کا زبان دان بنا دیا۔ اپنے مطالعے کے شوق کے بارے میں مولانا نے 1965ء میں پاکستان کے رسالہ 'نقوش' کے لئے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے:

'رطب یا بس' ہر قسم کی کتابیں پڑھ ڈالنے کا مرض بچپن سے تھا، کالج میں رہ کر قدرتاً یہ بہت ترقی کر گیا، شہر کی پبلک لائبریریوں پر روز دھاوا رہتا۔ کالج کی وسیع وعظیم لائبریری کا تو خیر کہنا ہی کیا، ڈاکٹر کیمرن نے ایک سرٹیفکیٹ میں لکھا: 'میرے علم میں کسی بھی طالب علم نے لائبریری سے اتنا استفادہ نہیں کیا، جتنا اس نے کیا ہے، کوئی ہادی ورہبر نہیں تھا اس لئے بہت سی کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے میں وقت ہی ضائع ہوا اور الٹے سیدھے، چت لیٹ کر اور اوندھے ہو کر دُھندلی روشنی میں کتب بینی سے آنکھ کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا وہ الگ''۔

تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد مولانا عبد الماجد لکھنو آ گئے، والد کا انتقال ہو چکا تھا، بینک میں گھر کی رقم ڈوب چکی تھی، ایسے میں معاشی تنگی کا شکار ہو گئے، رسالوں وغیرہ میں لکھ کر تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی تھی، لیکن اس سے زندگی بسر نہیں ہو سکتی تھی، ایسے میں بابائے اردو مولوی عبد الحق نے ان کی دستگیری کی، انجمن ترقی اردو کی طرف سے انہوں نے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا کام انکے سپرد کیا تو اس سے کافی آسانی پیدا ہو گئی، اس مشغولیت میں تین چار سال نکل گئے، اسی دوران سنہ 1916ء میں ان کی شادی باندہ کے رئیس شیخ یوسف الزماں کی صاحبزادی عفت النساء سے ہو گئی۔ اگلے ہی سال سر راس مسعود اور مولوی عبد الحق نے انہیں حیدر آباد بلوا لیا، یہ وہ زمانہ تھا جب عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے والی تھی اور اس کیلئے ہر علم وفن کی کتابیں تیار کی جا رہی تھی، یہاں انہیں تین سو روپے کی تنخواہ پر تقرری مل گئی، انہوں نے یہاں گیارہ ماہ کام کیا پھر استعفیٰ دے کر لکھنو واپس آ گئے، لیکن حیدر آباد میں انہوں نے اپنی غیر معمولی لیاقت کا جو اثر چھوڑا تھا اس کا ہی نتیجہ تھا کہ حضور نظام نے خاص طور پر انہیں حیدر آباد بلایا اور علامہ شبلی کی طرح ان کیلئے بھی 125 روپے ماہوار وظیفہ تقرر کر دیا، اس پر حیدر آباد میں رہنے کی شرط بھی نہیں تھی اس زمانے کے لحاظ سے یہ خاصی اچھی

رقم تھی۔ وزیر اعظم حیدر آباد سر محمد اسماعیل نے 1946ء میں یہ رقم دوسو کر دی تھی۔ سقوط حیدر آباد کے بعد 1948ء میں یہ پنشن بند ہو گئی تھی لیکن پھر پنڈت جواہر لعل نہرو نے ان کی درخواست پر پنشن واگزار کرا دی لیکن رقم صرف 125 روپے ہی رہی۔

مولانا کا ادبی سفر اس دور کے اخبارات ورسائل سے شروع ہوا۔ کالج کے زمانہ میں امرتسر سے نکلنے والے وقیع ادبی رسالے 'وکیل' میں ان کے دو مقالات، ایک تاریخی محمد غوری کے حالات پر اور دوسرا سبزی خوری اور گوشت خوری کے موضوع پر 'غذائے انسانی' کے عنوان سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد ان کے مضامین دوسرے رسائل میں بھی چھپ کر مقبول ہونے لگے، لیکن وہی زمانہ ان کی زندگی کا نہایت اہم موڑ ثابت ہوا جب مغربی افکار ونظریات کے غائر مطالعے نے انہیں اسلام سے برگشتہ کر کے الحاد کی راہ پر ڈال دیا۔

اسلام سے برگشتگی کی مدت 9 سال تک (1909ء تا 1918ء) قائم رہی۔ اس زمانہ میں وہ مسٹر عبد الماجد بی اے اور مغربی فلسفے کے ماہر کہلانے نے پر فخر کرتے رہے ان کا یہ دور مذہبی پہلو سے بقول خود ان کے الحاد وارتداد کا تھا۔ انہوں نے 1908ء میں کالج میں داخلہ لیا تھا، ان کے پسندیدہ مضامین فلسفہ اور نفسیات تھے، چونکہ ان مضامین کا بیشتر ذخیرہ انگریزی میں ہے اس لئے انگریزی کتابوں کا مطالعہ ناگزیر تھا۔ اس مطالعے سے ان کی معلومات میں جس قدر اضافہ ہوا اور الگ بات ہے لیکن اس کے اثرات اس طرح مرتب ہوئے کہ وہ ذہنی طور پر مذہب سے برگشتہ ہو گئے۔ اس دور میں وہ خود کو 'عقلیت پسند' لکھنے لگے تھے۔ اسی دور میں انہوں نے فلسفہ کی ایک کتاب 'فلسفہ اجتماع' کے عنوان سے لکھی جس میں اسلامی عقائد وشریعت کے بارے میں ایسی باتیں تھیں جو ایک مخالف اسلام ہی لکھ سکتا تھا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب وہ حیدر آباد پہنچے، جہاں انکی اسلام مخالف روش پر لوگوں نے سخت تنقید کی اور وہ

اس عہدے پر صرف گیارہ ماہ تک ہی رہ سکے اور وہاں کی مخالفت بھرے ماحول سے ایک طرح سے فرار حاصل کر کے لکھنو آ گئے لیکن قیام حیدرآباد کے دوران وہاں بہت سے لوگوں سے ان کے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے خاص طور پر سر امین جنگ سے تعلقات بیحد قریبی ہو گئے تھے جو ریاست کے صدر المہمام پیشی یعنی چیف سیکریٹری تھے۔ انہی کی سفارش پر حضور نظام نے انہیں تاحیات وظیفہ عطا کیا، اس کے لئے حیدرآباد میں قیام کی شرط نہیں تھی۔ اس کے لئے حیدرآباد میں قیام کی شرط نہیں تھی، البتہ یہ ضرور کہا گیا تھا کہ وہ اپنی تصانیف کو سلسلۂ آصفیہ سے منسوب کریں۔

اپنے اس دور کے بارے میں مولانا دریا آبادی لکھتے ہیں:

1910ء میں جوش الحاد میں آ کر مولانا شبلی کی 'الکلام' پر ایک تنقیدی نظر پانچ چھ نمبروں میں ماہ نامہ الناظر (لکھنو) کے لئے ایک طالب علم کے نام سے لکھی ادیب (الہٰ آباد) میں بھی دو چار مضمون لکھے۔ دوسرے رسالوں سے بھی مانگ آنے لگی۔ 'الندوہ' کے اخیر زمانہ میں اسے بھی دو مقالے ترجمے کر کے دیئے یہ بجائے خود ایک بڑا اعزاز تھا۔ الناظر کا مستقل مضمون نگار ہو گیا۔ اور چند سال بعد ادارات کے چند صفحے میرے لئے مخصوص ہو گئے۔ ان میں ''چلپی'' کے نام سے لکھا تھا۔ کتابوں پر تبصرے انکے علاوہ مولانا شبلی نے 1912 میں ایک اونچے پیمانہ پر سیرۃ النبیؐ لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس کیلئے مولانا کی فرمائش پر انگریزی رسالوں، مقالوں، کتابوں سے ترجمہ کرتا رہا۔ اور مولانا اس کا معاوضہ بھی ماہانہ عنایت فرماتے رہے۔ چند سال بعد جب 'معارف' (اعظم گڑھ) نکلا تو وہ گویا اپنی ہی تھا۔ جب چاہتا اس میں لکھتا پھر ایک عرصہ (19 تا 22) تک ایسا بھی ہوا کہ اس کے کچھ صفحات میرے ہی لئے مخصوص رہے اور اسکا مستقل معاوضہ مجھے وصول ہوتا رہا۔ مسلمانوں کا پہلا روزنامہ یو پی سے 'ہمدم' کے نام سے سید جالب دہلوی کی ادارت میں اکتوبر 1916ء سے نکلا۔ وہ بھی

گویا اپنا ہی تھا۔ 1919ء میں ہفتہ وار 'حقیقت' لکھنو سے نکلا، وہ شروع میں تمامتر اپنا ہی تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ 1924ء میں جب مولانا محمد علی کا روزنامہ ہمدرد دوبارہ دہلی سے جاری ہوا تو عملاً اس کا 'انچارج' میں ہی تھا۔ پھر جب 1928ء میں مولانا لمبے سفر پر یورپ گئے، تو میں باضابطہ بھی اس کا نگراں یا ڈائریکٹر قرار پا گیا۔ شروع 1925ء سے 'سچ' نکلا، پہلے مری شرکت میں اور پھر یکسر میرا ہو گئے۔ اس کی عارضی بندش کے بعد ظفر الملک مرحوم سے مجھ سے موافقت نہ رہ سکی سچ کے نام پر وہ قابض تھے۔ میں نے نیا پرچہ صدق کے نام سے نکالا پھر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر کے قانونی مصلحت سے اسے 'صدق جدید' کرنا پڑا۔

انگریزی مضمون نگاری کی مشق بھی ایک مدت تک رہی۔ چھوٹے چھوٹے مراسلے، لندن کے مشہور ہفتہ وار 'سیٹر ڈے ریویو' اور مشہور سائنسی ہفتہ وار 'نیچر' میں طالب علمی ہی کے زمانہ میں لکھ ڈالے۔ دو مقالے بمبئی کے نامور رسالے 'ایسٹ اینڈ ویسٹ' میں لکھے۔ ایک آدھ مدراس کے انڈین ریویو میں ایک آدھ مسز اپنی بیسنٹ کے ماہ نامہ 'تھیا سوفسٹ' اور 'ماڈرن ریویو' (کلکتہ) میں تو مدتوں مضمون نگاری بھی کی، اور اردو اور اسلامی کتابوں پر تبصرہ بھی عام اخبارات 'انڈین ڈیلی ٹلی گراف'، لیڈر، 'پانیئر'، 'بمبئی کرانیکل'، 'نیو انڈیا'، 'اسٹیٹس مین' میں مراسلہ نگاری اس کے علاوہ اب انگریزی تحریر کی مشق ایک مدت ہوئی کہ چھوٹ چکی ہے۔

تصنیف و تالیف مضمون نگاری ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے، بعض باریک فرقوں کے ساتھ یہ علت بھی شروع سے ساتھ لگی رہی۔ شروع شروع اس کا کام بھی مضمون نگاری ہی کی طرح، ادھر ادھر کی چھور چکاری سے چلتا۔ کچھ اس کتاب سے چرایا، کچھ اس سے اپنے نام سے ایک چیز تیار کر دی۔ مونگیر (بہار) کے ایک بزرگ مولانا محمد علی ناظم ندوہ بلکہ بانی ندوہ تھے انہوں نے مسیحیت کے رد میں جو کچھ لکھا تھا،

اسی کو پڑھ پڑھ کران کے دیئے ہوئے حوالہ تک بجنسہٖ نقل کر کے اپنی ایک چھوٹی موٹی کتاب تیار کردی۔ سن یہی 13-14 سال کا رہا ہوگا۔ آٹھویں یا نویں کا طالب علم تھا۔ اچھا ہوا کہ وہ مسودہ مدت ہوئی تلف ہوگیا۔ ورنہ اب دیکھ دیکھ کر شرمندگی ہی بڑھتی۔

ایک یونانی ڈرامے کے انگریزی ترجمے سے ترجمہ بھی اسی زمانہ میں کر گزرا تھا۔ وہ زمانہ مذہبیت کے دور کا تھا۔ آریوں اور مسیحیوں کے جواب میں کتابیں بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی 'سرمہ چشم آریہ' مولانا ثناءاللہ کی 'ترکِ اسلام' مولوی احسان اللہ عباسی گورکھ پوری کی الاسلام کا کمال عقیدت واحترام سے پڑھنا اب تک یاد ہے۔ پھر دور مولانا شبلی کے تسلط کا آیا۔ اور سچ یہ ہے کہ لکھنا اُلٹا سیدھا جو کچھ آیا، وہ اصلاً انہیں کا فیض ہے۔

کالج پہنچ کر جب عقائد میں فتور آیا، تو طبیعت کا رخ اسلام سے الحاد کی مڑ گیا، انگریز ملحدین کی کتابیں بہ کثرت پڑھنے سے۔ تو اسی زمانہ میں ایک کتاب پروفیسر ہکسلے پر بڑے چاؤ اور اہتمام سے لکھنا شروع کی، اور اسے معنون بھی مولانا شبلی ہی کے نام سے کیا۔ الحمدللہ کہ اب اس کا مسودہ بھی معدوم ہے۔ سن شعور پر پہنچ کر پہلی بار باضابطہ کتاب 'فلسفۂ جذبات' قلم سے 1913ء میں نکلی۔ سن کا اس وقت 21 واں سال تھا۔ کتاب انجمن ترقی اردو نے لکھوائی اور اسی نے چھاپی (صحیح نام 'نفسیات جذبات' ہونا چاہئے تھا مگر نفسیات کی اصطلاح اس وقت تک نامانوس تھی) اب اس کی کوتاہیوں پر ہنسی تو کم آتی ہے، غصہ زیادہ آتا ہے۔ دوسری کتاب ہر اعتبار سے لغو 'فلسفۂ اجتماع' لکھ ڈالی۔ جس کا ایک ایک صفحہ الحاد سے داغدار، اس کی اشاعت وفروخت مدت دراز ہوئے بند کرا چکا ہوں۔ پھر دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے چھاپیں ایک 'تاریخ اخلاق یورپ' (پوری) اور دوسری 'تاریخ تمدن انگلستان' (جزواً) ایک ڈرامہ بھی 'ناظر' کے فرضی نام سے اس درمیان میں لکھ ڈالا۔

1917ء میں حیدرآباد جانا ہوا۔ یونیورسٹی کے سررشتہ ترجمہ وتالیف میں۔ وہاں ایک خاص ضخیم کتاب منطق پر لکھی اور جو خالی وقت بچ گیا اس میں ترجمہ 'تاریخ یورپ' کا کیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے لئے فلسفہ میں مکالمات برکلے کا ترجمہ کیا۔

دس سال تک ملحد رہنے کے بعد خیالات میں پھر انقلاب پیدا ہوا (تفصیل آگے آرہی ہے) ہندو فلسفہ وتصوف کا درمیانی راستہ طے کرتے ہوئے اسلامی تصوف کی طرف آیا اور 1921ء میں از سرنو مسلمان ہوگیا۔ اس درمیانی دور میں ایک فرنچ فلسفی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ مع اپنے اسلامی قسم کے حواشی اور دو مستقل بابوں کے اضافہ کے 'پیام امن' کے نام سے کردیا تھا اور مصحفی کی ایک عاشقانہ مثنوی بھی ایڈٹ کر ڈالی تھی تجدید اسلام کے بعد توجہ از سرنو اسلامیات کی جانب ہوئی۔ بھولی بھالی زنگ خوردہ عربی کو پھر سے تازہ اور صاف کیا۔ اور سرگرم مطالعہ پہلے تو تصوف اسلام کا رہا۔ بزرگوں کے ملفوظات، تذکرے اور سب سے بڑھ کر مثنوی مولانائے روم اور اس کے بعد مطالعہ حدیث وفقہ اور آخر میں تفسیر کی باری آئی۔ بہت کچھ اردو ترجموں سے بھی سہارا لے کر۔ تھانہ بھون کی حاضری 1928 سے شروع ہوچکی تھی۔ وہیں خانقاہ میں دو ایک سال بعد ایک صاحب نے ہمت دلائی کہ قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں جمہور اہل سنت کے نقطۂ نظر سے کر ڈالو ہمت آخر کار کسی طرح بندھ گئی اور جس کا کلام ہے، اسی کی توفیق وامداد سے کئی سال کی مشقت میں کام جوں توں کر ڈالا۔ تفسیری حصہ بھی لشتم پشتم ہوگیا۔ قرآن کے بے شمار معجزات میں ایک معجزہ اسے بھی سمجھنا چاہئے کہ مجھ سے کم علم، بلکہ بے علم سے بھی یہ کام کرالیا۔

یہ دور ٹھیٹھ مادیت کا کوئی آٹھ نو سال قائم رہا۔ 17-1918 تک بلکہ ابھی 1918ء ہی چل رہا تھا کہ ایک دوست نے ایک انگریز کی لکھی ہوئی کتاب بدھ مذہب پر تحریف کے ساتھ دی۔ اس سے خیالات میں انقلاب کی شروعات ہوئی اور مادیت

کی صلابت وجمود پر پہلی بار ضرب لگی۔ ذہن نے کہا کہ مادیت کے سوا کچھ اور آوازیں بھی سننے کے قابل ہیں۔ عین اسی زمانہ میں بعض اور غیر معروف مذہبوں (مثلاً دین کنفیوشس چینی) کی کتابوں کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی باتیں بھی کچھ کچھ دل کو لگنے لگیں۔ ان ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ ایک طاقتور اور ہندو فلسفہ تصوف کی آئی۔ ان کے ہاں کی مشہور کتاب ''بھگوت گیتا'' (مسز اینی بیسنٹ) کی ترجمہ کی ہوئی نظر سے گزری اور اس نے ایک زبردست ضرب ملحدانہ فلسفہ مادیت پر لگادی۔ بنارس کے ڈاکٹر بھگوا داس اور دوسرے ہندو فلسفیوں، مفکروں، رشیوں اور یوگیوں کی کتابوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ یعنی فرنگیت کے زہر کے لئے تریاق کا آر بندو گھوش کی کتابیں گو سمجھ میں نہ آئیں، پھر بھی انہیں پڑھ گیا۔ ٹیگور اور گاندھی جی بھی اس مرحلہ میں بڑے معین ومفید ثابت ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے میں ملحد و دہری سے ایک ہندو قسم کا صوفی بن گیا۔ اردو میں یوگ بششٹ کی قسم کی کتابیں بھی بہت کام آئیں۔ سال سوا سال اس دور کے گزرے ہوں گے اور نظر سے اب مسلمان درویشوں کے بھی ملفوظات اور خوارق، کرامات کے تذکرے بھی دلچسپی وعقیدت کے ساتھ گزرنے لگے تھے کہ حکمت کاملہ نے عین وقت پر دستگیری کی اور ایک عزیز کے ذریعہ سے مثنوی مولانا روم کا کانپوری نسخہ خوشخط، خوشنما، محشیٰ، چھ جلدوں میں ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بیسویں کیا سینکڑوں شعر مطلق سمجھ میں نہ آئے لیکن تاثر کا یہ عالم کہ کتاب ایک مرتبہ کھول کر دبند کر دینے کو جی ہی نہ چاہے۔ بس جی میں یہی کہ اسے بند کمرہ میں تنہائی میں پڑھتے چلے جایئے اور چیخ چیخ کر روتے جایئے! قدرت کے کرشمے دیکھئے کہ مثنوی ختم ہی ہوئی تھی، کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبیؐ جلد اول دیکھنے میں آگئی اور اس سے ذات رسالت کے ساتھ جو بغض وعناد سا پیدا ہو گیا تھا وہ دور بلکہ کافور ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نبی تو نہیں، البتہ ایک بڑے اچھے مصلح نظر آنے

لگے۔ اس منزل پر تھا کہ محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن ایک عزیز کے پاس دیکھنے کو مل گئی۔ اس نے تریاقیت کا تکملہ کیا۔ اور اب میں توحید ورسالت دونوں کا قائل تھا۔ اور قرآن کا مصدق۔

حضرت اکبرالہٰ آبادی کی حکیمانہ گفتگو میں اور مولانا محمد علی جوہر کی نظمیں خطوط اور گفتگوئیں سب اس راہ نمائی وہدایت یابی میں شریک حال رہیں۔ اور شاید سب سے بڑھ کر میرے والد مرحوم کی وہ دردِ دل کے ساتھ نکلی ہوئی مخلصانہ دعائیں، جو انہوں نے ذی الحجہ 1330ھ (نومبر 1912ء) میں غلاف کعبہ کو پکڑ کر میری اصلاح وہدایت کیلئے رب کعبہ سے مانگی تھیں! کتابوں کے سلسلہ میں آخری کتاب اس نوعیت کی ''مکتوبات مجدد سرہندی'' تھی امرتسر کے چھپے ہوئے خوشنما وخوشخط محشیٰ نسخہ کے نوحصہ میں نے قریب قریب سب پڑھ ڈالے اور اب میں ارتداد کے چنگل سے بالکل چھوٹ کر از سرنو اسلام وایمان کے دائرہ میں داخل ہوا۔''

جہاں تک مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی شاعری کا تعلق ہے انہیں ہر لحاظ سے روایتی کلاسیکی غزل کا قادر الکلام شاعر قرار دیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں درج چند اشعار سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ مولانا صرف شاعری کرتے تو بھی انکا شمار ادبی تاریخ کے مشاہیر میں ہی ہوتا:

نامرادی مری ہمزاد تھی تو کیوں یارب
میری قسمت میں لکھا صاحبِ ارماں ہونا

زینتِ حسن ہے خود آپ پہ نازاں ہونا
نازش، زخم جگر رہن نمکداں ہونا

دل یہ کیا جانے کہ شمشیر ہے کیا تیر ہے کیا
اس کو بسمل ترے انداز وادا نے رکھا

شوخیاں تیری نہ ظاہر ہوئیں خود تجھ پہ بھی
مجھ کو دھوکے میں تری شرم وحیا نے رکھا

ہر شے سے ٹپکتا ہے مرا جذب تمنا
نالے کا اثر دیکھ کر تاثیر وفا دیکھ

حد سے نہ گزر مشغلۂ جو میں اے یار
نازک ہے بہت رشتۂ پیمانِ وفا دیکھ

آشفتہ سری پر مری کیوں طنز ہے اتنا
تو خود تو ذرا برہمی زلفِ دوتا دیکھ

اس نے خود داری ناظرؔ کو مٹا کر چھوڑا
یہ محبت بھی عجب سخت بلا ہوتی ہے

رہی ہر چند عقل صبر آموز
نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں

غالب کی زمینوں پر مولانا نے بہت سی غزلیں کہیں، ملاحظہ ہوں انکے چند اشعار:

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں مری وحشتیں کہ اب
غم خوار مجھ کو بستۂ زنجیر کر چلے

حیراں ہوں میں ان کے جس میں کیا ایسا صحر
میرے بھی دل کو جس سے وہ تسخیر کر چلے

یہ کیا ہوا کہ ان کی جفاؤں کا ذکر چھیڑ
ناظرؔ بھی شکوۂ فلک پیر کو چلے

مجھ کو محروم کرم میری وفا نے رکھا
ان کو مشغول ستم ان کی جفا نے رکھا

دل یہ کیا جانے کی شمشیر ہے کیا تیر ہے کیا
اس کو بسمل ترے انداز وادا نے رکھا

شوخیاں نہ ظاہر ہوئیں خود مجھ پر کبھی
تجھ کو دھوکے میں تری شرم وحیا نہ رکھا

پھر ہے بے تاب زباں عرض تمنا کے لئے
دیکھتے دیکھتے پھر مجھ سے خطا ہوتی ہے

اکبرالہٰ آبادی ان کے والد کے دوستوں میں سے تھے جوان کے کفر والحاد کے زمانے میں انہیں نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے ایسے خیالات سے باز رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور نظریات سے وہ بیحد متاثر تھے۔ ایک طرح سے وہ اس عظیم مجاہد آزادی سے عشق کرتے تھے۔ ان کی اسی عقیدت اور قلم کی غیر معمولی صلاحیت نے انہیں محمد علی جوہر اور ان کے اخبار 'ہمدرد' سے اتنا قریب کر دیا کہ وہ ایک طرح سے اس کے قائم مقام ایڈیٹر بن گئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف محمد علی جوہر کی سوانح حیات لکھی بلکہ ان کے خطوط جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کئے۔ ان کے لندن میں انتقال کے بعد ان کا شعری دیوان بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اگرچہ مولانا ماجد دریا آبادی کی لیاقت اور خلوص کے معترف تھے۔ مولانا کے ذہن پر مغربی فلسفہ دانوں کا فاسد اثر ان بزرگوں کے پند ونصائح سے زیادہ ان کے شوق مطالعہ سے دور ہوا۔ بہر حال انکی زندگی میں انقلاب آیا اور ان کے اندر سویا ہوا مومن جاگ اٹھا۔ جناب مالک رام لکھتے ہیں: ''بحمدہ الحاد کے بادل چھٹ گئے۔ 21-1920ء کے دو سال گویا ایمانی برزخ کا زمانہ تھا۔ اب وہ دوبارہ

مسلمان ہوگئے ۔ پھر تو اسلام کی بڑی خدمت کی۔ قرآن کریم کے دو ترجمے اور تفسیریں (اردو اور انگریزی)، تصوف اسلام، بشریت انبیاء، سیرت نبویؐ، حیواناتِ قرآنی، شخصیاتِ قرآنی، مشکلاتِ قرآن انکی یادگار ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ہفتہ وار 'سچ'، 'صدق'، یا 'صدق جدید' بھی اس سلسلے کی کڑی ہے۔

1943ء میں انہوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت کی درخواست کی، انہوں نے فرمایا کہ آپ مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کر لیجئے۔ تعمیل ارشاد میں حضرت مدنیؒ سے بیعت کر لی۔ حضرت تھانویؒ سے انہیں قلبی عقیدت تھی، اس کا اظہار ان کی کتاب 'حکیم الامت: نقوش وتاثرات' سے بخوبی ہوتا ہے۔ ملحدانہ اثرات سے واپس اسلام کے دامان رحمت میں آنے کے بعد ان کی روح کی گہرائیوں تک ایمان ویقین کی روشنی سما گئی۔ انہوں نے جوانی کے دنوں میں ہاتھ پر اپنا نام گدوالیا تھا جس کے لئے آنحضرت ﷺ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ اس حدیث پر نظر پڑتے ہی مولانا نے کلائی کی جلد اتر اوادی اس عمل جراحی میں نا قابل برداشت تکلیف کا سامنا کیا، لیکن شعائر اسلام کے احترام میں یہ تکلیف خندہ پیشانی سے برداشت کی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی نجی زندگی پر سکون رہی، ان کے کئی بیٹے ہوئے لیکن یہ اللہ کی مرضی تھی کہ وہ زندہ نہیں رہے۔ البتہ چار صاحبزادیاں زندہ رہیں۔ رافت النسا، حمیرہ خاتون، زہرا خاتون اور زاہدہ خاتون۔ ان کی شادیاں علی الترتیب مولانا کے بڑے بھائی عبدالمجید مرحوم کے چاروں صاحبزدوں حکیم عبدالقوی عرف آفتاب احمد، حبیب احمد، معروف دانشور ڈاکٹر ہاشم قدوائی اور جناب عبدالحلیم قدوائی ایڈوکیٹ سے ہوئیں۔

50 سے زائد کتابیں مولانا کی علمی، ادبی اور دینی عظمت کی یادگار ہیں، جن میں غذائے انسانی، محمود غزنوی، فلسفۂ جذبات، فلسفۂ اجتماع، سائیکالوجی ان لیڈر

شپ (انگریزی)، مکالمات برکلے، فلسفہ اور اس کی تعلیم، فلسفیانہ مضامین، مبادی فلسفہ، حصہ اول، حصہ دوم، ہم آپ، منطق، تاریخ اخلاق یورپ، حصہ اول ودوم، تاریخ تمدن، حصہ دوم، تاریخ یوروپ، پیام امن، تصوف اسلام، فیہ مافیہ (فارسی) زود پشیماں (ڈرامہ)، مثنوی بحرالمحبت، مقالات ماجد، انشائے ماجد (دو حصے)، نشریات ماجد، مضامین عبدالماجد، اکبر میری نظر میں، مکاتیب اکبر، خطوط مشاہیر، مکتوبات سلیمانی (دو حصے)، سفر حجاز، دھائی ہفتے پاکستان میں، حکیم الامت، محمد علی (ذاتی ڈائری، دو حصے)، تفسیر ماجدی (انگریزی) ترجمہ قرآن (انگریزی)، تفسیر ماجدی اردو، تفسیر ماجدی (ترمیم شدہ، تین حصے) الحیوانات فی القرآن، ارض القرآن، اعلام القرآن، قصص ومسائل، بشریت انبیاء، خطبات ماجدی، مشکلات القرآن، حدیث ودعائیں، شرح چہل حدیث والی اللہی، مردوں کی مسیحائی، صابر رسول، یتیم کا راج، تمدن اسلام کا پیام، تحفۂ خسروی، فرائض والدین، مشاہیر سائنس، خطبۂ صدارت خلافت کانفرنس، ندوہ کا پیام ندویوں کے نام، نورانی جہیز، معاصرین، آپ بیتی وغیرہ ہیں۔ اپنے ہم عصروں کے بارے میں ان کی کتاب 'معاصرین' اور دوستوں کے انتقال پر ان کے جذبات وتاثرات پر مبنی کتاب 'وفیات ماجدی' خوبصورت نثری نمونہ ہی نہیں بلکہ حوالہ جاتی اہمیت کی حامل ہے۔

ان کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے عربی ادبیات 1965ء میں سرفراز کیا گیا۔ اتر پردیش حکومت کی جانب سے انعام ملا، 1976، میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ علاوہ ازیں ملک کی دوسری مذہبی، سماجی اور ادبی تنظیموں نے ان کی شایان عزت افزائی کی۔ انہیں 1929ء میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی، واپسی پر ''سفرنامہ حجاز'' کے عنوان سے ایمان افروز کتاب لکھی۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی ذات گرامی بلاشبہ امت مسلمہ اور اردو زبان وادب کے لئے شجر سایہ دار تھی۔ آپ کا انتقال بعارضہ فالج 6؍جنوری 1977ء کو لکھنو میں ہوا۔ نماز جنازہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ندوۃ العلماء کے میدان میں پڑھائی۔ آپ کا جنازہ دریا آباد لے جایا گیا جہاں حضرت مخدوم آب کشؒ کے مزار شریف کے جوار میں تدفین ہوئی۔ پوری اردو دنیا میں مولانا کا سوگ منایا گیا۔ پروفیسر احتشام حسین کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اپنے بہت سے علمی کاموں سے قطع نظر مولانا دریا آبادی اپنے ادبی اسلوب کی وجہ سے بھی زندہ رہیں گے۔

☆☆☆

بحرالعلوم

حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود [۱۲]

عرف حکیم ننھو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نبیرہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

امام ربانی قطب الارشاد وحضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے عالمِ اسلام میں کون واقف نہیں تمام دینی ومذہبی ادارے اور اہلِ علم وفضل آپ کی علمی صلاحیتوں اور بزرگانہ مقام ومرتبہ سے بخوبی واقف ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے وصال کے بعد آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ حکیم مسعود احمد صاحب کے بڑے صاحبزادے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے نبیرہ ہیں۔ آپ کے علم وفضل کا چرچا علماء کے درمیان بچپن سے ہی تھا۔ گویا حضرت گنگوہیؒ سے علم وفضل آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ آپ صرف اٹھارہ برس کی عمر میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ تو ارباب دارالعلوم دیوبند نے آپ کو پیش کش کی تھی کہ دارالعلوم آپ کا تقرر کرنے کیلئے تیار ہے آپ بخاری شریف کا درس دیں۔ یعنی شیخ الحدیث کے منصب کی پیش کش کی تھی۔ لیکن حکیم صاحب نے یہ کہہ کر معذرت کر لی تھی کہ درس وتدریس کا میرا مزاج نہیں ہے۔

[۱۲] ماخوذ: فیضان گنگوہی، مولف محمد ادریس حبان رحیمی، مطبوعہ رحیمی کتب خانہ بنگلور

آپ نے طالب علمی کے دور میں شجرہ علماء دیوبند تیار کیا تھا۔ یعنی علماء دیوبند کا سلسلہ حضور اکرم ﷺ سے کیسے ملتا ہے؟ ناچیز نے بھی اس شجرہ کی زیارت کی وہ تقریباً چھ فٹ لمبا شجرہ تھا۔ جسکا بیشتر حصہ دیمک نے کھالیا تھا۔

قارئین کرام حیران ہو رہے ہوں گے کہ شخصیت کی تعریف تو کر رہے ہیں لیکن نام ابھی تک ظاہر نہیں کیا ہے تو لیجئے۔ آپ بھی ان سے ملاقات کریں۔ آپ ہیں بحر العلوم حضرت مولانا حکیم عبد الرشید محمود عرف حکیم نھو میاں صاحبؒ، آپ کو نظافت نفاست اور پاکیزگی حضرت گنگوہی سے ملی تھی۔ آپ نہایت خوبصورت ذہین اور صاحب الکلام تھے۔ آپ کی مجلس میں بڑے بڑے علماء کرام حاضر ہو کر علمی نکات سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ اور قرآن وحدیث کے رموز واسرار سے اپنے دامن بھرتے تھے۔ آپ نہ صرف قادر الکلام تھے بلکہ بحر العلوم کے گراں قدر غواص چن کر حاضرین مجلس کے سامنے پیش کرتے تھے آپ کی مجلس کا رنگ ڈھنگ کبھی امام اعظمؒ کی مجلس کا ہوتا اور کبھی امام احمد ابن حنبلؒ اور کبھی حافظ شیرازیؒ اور کبھی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور کبھی حضرت گنگوہیؒ اور کبھی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی مجلس کی جھلک نظر آتی تھی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جید اور ذی شعور علماء بھی آپ کے کلام کو سمجھنے سے قاصر رہتے۔ اور محو حیرت ہو جاتے کہ کیا بول رہے ہیں؟ کہاں سے بول رہے ہیں۔ آپ کی زندگی میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش میں کوئی عالم دین آپ کے مقام ومرتبہ کے برابر نہیں تھا۔

میں نے دیکھا کہ امام الشریعت والطریقت حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور حضرت حکیم صاحب سے ملاقات کیلئے تشریف لاتے تو عوام کا جم غفیر ہوتا۔ حضرت حکیم صاحب شیخ کو مخاطب کرنے کیلئے فرماتے ''شیخ''، تو حضرت جواب میں فرماتے ''لبیک یا سیدی'' حضرت شیخ۔ حکیم صاحب کا بڑا اکرام

فرماتے۔ کیونکہ شیخ کے والد محترم حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں تاحیات رہے خانقاہی نظام کو بحسن خوبی سنبھالا، حضرت گنگوہیؒ کے مزاج سے خوب واقف تھے۔

دو ہستیاں ایسی ہیں جنہوں نے حضرت گنگوہیؒ کی گود میں پرورش پائی ہے ایک حضرت شیخ زکریا صاحبؒ دوسرے حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ ان دونوں حضرات کو بچپن میں حضرت گنگوہیؒ کے پاس رہنا نصیب ہوا اور حضرت کی شفقتیں اور نظرِ عنایات حاصل ہوئیں۔

مزید تیسری شخصیت ہے جن کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ وہ ہیں حافظ اللہ دیا صاحبؒ جھنجھانوی جو اپنے ماموں کے ساتھ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں جب حاضر ہوئے تو ان کی عمر صرف آٹھ سال تھی امام ربانی اس وقت (بظاہر) نابینا ہو گئے تھے۔ آپ کے ماموں نے سلام کیا اور خیر وعافیت کے بعد پاؤں دبانے لگے۔ آٹھ سالہ بچے نے بھی سلام کے بعد اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو حضرت کے پاؤں سے مس کیا تو حضرت نے پوچھا کون ہے؟ ماموں نے کہا حضرت یہ میرا بھانجہ ہے اللہ دیا۔ فرمایا۔ یہ تو قطب مدار ہے اور اسی نشست میں بیعت فرمالیا اور خلافت سے نوازا۔ (اللہ اکبر) حالانکہ حافظ اللہ دیا صاحبؒ نہایت معمولی گھرانے کے فرزند تھے اور کمہار برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد دنیا نے دیکھا کہ یہ تینوں شخصیات عالمِ اسلام کی مخدوم ہوئیں۔

حضرت حکیم صاحبؒ دار العلوم دیوبند زیر تعلیم تھے۔ تو حضرت شیخ الاسلامؒ ان کے بڑے نخرے برداشت کرتے تھے۔ کبھی کبھی حکیم صاحب کہدیا کرتے تھے آج میں سبق میں نہیں جاؤں گا۔ تو حضرت مدنیؒ ان کے کمرے پر بذاتِ خود تشریف لاکر سمجھا کر اپنے ساتھ درسگاہ لے جاتے۔ اور فرماتے چلئے صاحبزادے میرے ساتھ

چلئے۔ کیوں ناراض ہیں آپ؟ کبھی کبھی سبق کے بعد فرماتے صاحبزادۂ محترم آج کی تقریر بطور خاص آپ کے لئے تھی۔ آپ نے سمجھ لیا ہے نا؟

یہ بات تو مشہور ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے۔ کچھ ایک ایسا ہی سچ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ حضرت حکیم نھومیاں صاحبؒ نے ایک مرتبہ سبق کے دوران شیخ الاسلام کے پاس پرچی بھیجی۔ اس وقت یہ دستور تھا کہ کوئی بھی طالب علم شیخ الاسلام کے پاس سوالات کی پرچی بھیج سکتا تھا۔ چنانچہ سبق کے بعد اس قسم کی پرچیوں کے جواب شیخ الاسلام دیا کرتے تھے جب یہ پرچی شیخ الاسلام نے ملاحظہ فرمائی۔ تو اس میں لکھا کہ حضرت آپ کبھی جلسوں میں کبھی دیگر پروگراموں میں جاتے رہتے ہیں حالانکہ آپ کے جانے سے طلباء کے اسباق کا حرج ہوتا ہے آپ کو اسکا خیال نہیں ہے۔ کیوں کہ پرچی کے آخیر میں پرچی لکھنے والے کا نام نہیں تھا۔ اس لئے معلوم نہ ہوسکا کہ کس نے پرچی بھیجی ہے۔ اس وقت شیخ الاسلام کو سخت ناگواری ہوئی نہیں معلوم آپ کس حال میں تھے۔ ارشاد فرمایا۔ جس نے یہ پرچی لکھی۔ اس کے علم سے نہ اسکو نہ دوسروں کو فائدہ پہونچے گا۔ بعد میں کسی شاگرد نے بتایا کہ حضرت وہ پرچی تو صاحبزادہ محترم نے بھیجی تھی۔ حضرت نے سنا تو افسردہ ہوگئے فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون فرشتے لکھ چکے ہیں۔ اس واقعہ سے میرا مقصد ہرگز حضرت حکیمؒ کی تحقیر نہیں ہے۔ کیوں کہ راقم الحروف کو خود حضرت حکیم صاحبؒ سے طب کے کچھ اسباق پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ اور نہیں معلوم کس کس نے کیا کیا پڑھا ہوگا۔ حکیم محمد غفران صاحب گنگوہیؒ نے بھی کچھ اسباق طب کے حضرت حکیم صاحب سے پڑھے تھے۔ اور آپ کی مجلس تو صبح دس بجے سے ایک بجے تک عوام وخواص کے لئے منعقد ہوتی تھی۔ علمائے کرام گروہ کے گروہ آتے اور اپنے اپنے مسائل حل کر کے واپس ہوتے۔ مدارس کے ذمہ داران اور طلبائے عزیز بھی حاضر ہوتے اور کبھی حکیم

صاحب ان سے اور کبھی وہ حکیم صاحب سے سوالات کرتے۔ جب تک آپ حیات رہے علمی جواہر پاروں سے طالبین کے دامنوں کو بھرتے رہے۔ آپ اپنی حیات مبارکہ میں علمائے حق کے سرخیل تھے۔ آپ کی ذاتِ مبارکہ سے امت کے ایک بڑے طبقہ نے فیض حاصل کیا اور علمی تشنگی بجھائی۔

لیکن جس مقام کے آپ عالم اور فاضل تھے اس اعتبار سے آپ کسی نہ کسی بڑی درسگاہ کے شیخ الحدیث ہوتے یا کسی بڑے ادارے کے مہتمم اور صدر مدرس ہوتے۔ اس حالت میں آپ سے جو فیض علمائے کرام اور طلباء کو اور امت کو پہونچتا۔ وہ نہ پہونچ سکا اور علم کا سارا خزانہ آپ کے ساتھ قبر میں دفن ہوگیا۔ (شاید اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا) اسکے باوجود آپ نے کئی کتابیں لکھیں۔ آپ کی ایک تصنیف بنام ذکر النبیؐ میرے پاس موجود ہے۔ (جسکا جدید ایڈیشن جلد ہی انشاء اللہ شائع کیا جائے گا) حضرت حکیم نھومیاں صاحبؒ اپنے والد محترم مولانا حکیم مسعود احمد صاحبؒ کی طرح ماہر نباض بھی تھے اور نبض شناس کے ساتھ ساتھ مردم شناس بھی تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک انگریز افسر مولانا حکیم مسعود احمد صاحبؒ کے مطب میں آیا اور کہا میرے سر میں دو سال سے شدید درد ہے حکیم صاحب نے نبض دیکھی اور فرمایا بیٹھے رہو، دیگر مریضوں کو دیکھ کر رخصت کرتے رہے۔ اور مطب بند کرنے کا وقت آ گیا۔ حکیم صاحب نے افسر سے کہا آپ کل آ جائیں۔ میں آپ کو کل دیکھوں گا!

انگریز افسر ناراض ہوکر چلا گیا دوسرے دن مطب کھلتے ہی حاضر ہوگیا۔ حکیم صاحبؒ نے کہا ابھی بیٹھے رہئے۔ چنانچہ اس دن بھی دیگر مریضوں کو دیکھتے رہے یہاں تک کہ مطب کا وقت ختم ہونے لگا۔ تو انگریز افسر نے کہا مجھے کب دیکھو گے؟ حکیم صاحب نے کہا کل دیکھیں گے۔ اس پر افسر کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور کہا کل بھی نہیں دیکھا اور آج بھی ایسے ہی بٹھائے رکھا۔ کیا بات ہے؟

حکیم صاحب نے کہا۔ اچھا بیٹھو بیٹھو۔ میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔ چنانچہ حکیم صاحب نے ایک سفوف دیا اور کہا اسکو سونگھو! اس نے وہ سفوف اپنی چٹکی میں لیتے ہوئے ناراضگی سے کہا اس سے کیا ہوگا۔؟ حکیم صاحب نے کہا سونگھو اور جب چھینک آئے تو رومال میں چھینکنا۔ آفیسر نے جیسے ہی سفوف سونگھا تو زور کی چھینک آئی جس کو اس نے رومال میں لے لیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا۔ دیکھو چھینک میں کیا نکلا ہے؟ اس نے دیکھا تو ایک لمبا کنکھجورہ تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اور کہا حکیم صاحب یہ کیسے نکلا ہے ناک سے؟ تو فرمایا جب یہ باریک کیڑا تھا کسی طرح تمہارے دماغ میں پہونچ گیا اور دماغ چاٹتے چاٹتے بڑا ہو گیا اسی کی وجہ سے درد ہوتا تھا۔ کل اور آج لمبے وقت تک تم کو اس لئے بٹھایا کہ غصہ آئے۔ غصہ آنے پر دماغ ہلتا ہے سکڑتا ہے تو یہ کنکھجورہ اپنے پنجے باہر نکال لیتا ہے۔ اسلئے پہلے غصہ دلایا اور پھر چھینک کے ذریعہ اسکو باہر نکالا۔ افسر نے کہا نہایت ادب سے معافی مانگی اور شکریہ ادا کیا۔ تو ایسے ماہر نباض تھے حکیم مسعود احمد صاحبؒ۔ اسی طرح حضرت حکیم نھومیاں صاحبؒ بھی ماہر نباض تھے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ایک خاتون نے اپنی نبض دکھائی حکیم نھومیاں صاحبؒ نے نسخہ تجویز فرمادیا۔ آٹھ دن کے بعد پھر ایک خاتون نے آکر نبض دکھائی اور نسخہ لکھوایا۔ تو حکیم صاحب نے خاتون سے مخاطب ہوکر فرمایا آٹھ دن قبل تمہاری نبض بڑی طاقتور تھی صرف آٹھ دن کے بعد ایسی کمزوری تمہاری نبض میں کیسے آگئی ؟ تو خاتون نے عرض کیا حکیم صاحب آٹھ دن قبل میری بیٹی نے نبض دکھائی آج میں اسکی ماں حاضر ہوئی ہوں تو فرمایا۔ اوہو، ماں، بیٹی کی مماثلت کی وجہ سے نبض کی ساخت اور رفتار ایک سی معلوم ہورہی ہے اس کی وجہ سے مغالطہ ہوگیا۔ ایک بار کچھ لوگوں نے آپس میں طے کیا۔ اور حکیم نھوں میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فرمایا۔ کہاں سے آئے ہو؟ عرض کیا فلاں گاؤں سے حاضر ہوئے ہیں۔ پوچھا کیا بات

ہے۔ عرض کیا۔ ایک مریضہ کو لائے ہیں۔ وہ باہر بہلی (رتھ بیل) میں بیٹھی ہے۔ فرمایا اندر لے کر آجاؤ۔ عرض کیا حضرت وہ نہایت ہی پردہ دار خاتون ہیں باہر نکل کر آنا پسند نہیں کرتیں۔ فرمایا۔ چلو ہم ہی چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا۔ حضرت وہ کسی نامحرم کو اپنا ہاتھ دکھانا بھی پسند نہیں کرتیں۔ حکیم صاحب نے فرمایا اچھا۔ پھر ایسا کرو ایک ڈی ایم سی کا دھاگہ ان کے گٹے میں باندھ دو اور دھاگے کا دوسرا سرا میرے پاس لے آؤ۔ چنانچہ بہلی کے اندر موجود عورت کے ہاتھ میں دھاگہ باندھ دیا گیا۔ اور دوسرا سرا حکیم صاحب کے پاس لیکر آگئے۔ آپ نے ایک منٹ دھاگے کو آنکھیں بند کر کے کچھ ملاحظہ فرمایا۔ اور سخت ناراض ہوکر فرمایا۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ بہلی میں کوئی جاندار نہیں بیٹھا ہے؟ تو حاضرین نے معذرت چاہی کہ حکیم صاحب ہم تو صرف آزمانے کے لئے آئے تھے۔ کہ واقعی آپ نباض ہیں یا نہیں۔ حقیقت میں بہلی میں نا کوئی عورت ہے نا مرد ہے۔ بلکہ ہم نے یوں ہی دھاگہ اندر لکڑی میں باندھ دیا تھا۔ حاجی مصطفیٰ کامل صاحبؒ نے ایک بار ہم لوگوں کو بتایا کہ میرے پیٹ میں ایک مرتبہ ایسا درد ہوا کہ تمام ڈاکٹر عاجز آگئے۔ والدہ نے فرمایا ارے نھوتو ہی دیکھ لے کامل کو۔ اسے کیا ہوگیا ہے سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ حکیم نھوں صاحب نے نبض دیکھی۔ پاؤں کی نبض دیکھی۔ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دیکھا لیکن کہیں بھی درد کا شائبہ نظر نہیں آیا تو حکیم صاحب نے فرمایا بھئی کامل تمہاری ایکٹنگ بہت زبردست ہے واقعی ہار مان گئے۔ جسم کی بے قرار جھوٹی ہے نبض کی رفتار سچ ہے۔ اور یہ کہہ کر واپس ہوگئے۔ تو ماں نے پوچھا ارے کامل کیا بات ہے، نھوتو کہہ رہا ہے کامل بہانہ کر رہا ہے۔ تو اجان ہنسنے لگے اور کہا اماں میں تو بھائی جان کو آزما رہا تھا کہ دیکھو کیا کہتے ہیں مجھے درد وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں اس مختصر سے مضمون میں ان کے لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔

سوئے اتفاق کہ حضرت حکیم نخومیاں صاحبؒ نے ایک شیشی میں سے سفوف لے کر کھالیا۔ پانی سے سفوف پھانکنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ تو خطرناک زہر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جسم پر آبلے آنے شروع ہوگئے اور تمام جسم بڑے بڑے آبلوں سے بھر گیا۔ زندگی دوبھر ہوگئی۔ اس وقت کے جو بھی ڈاکٹر تھے انہوں نے ہاتھ اٹھادئے اور کہا ایسا خطرناک زہر کھالیا اس میں یہ جان برنہ ہوسکیں گے۔

حکیم صاحب نے اہل خانہ سے فرمایا۔ اصل گھی گرم کرو۔ اور صبح شام پاؤ پاؤ بھر گھی نوش فرمایا۔ اور کچھ ادویات بھی اسکے ساتھ استعمال فرمائی۔ زبردست جلاب ہوتے رہے۔ اور برابر گھی اور دیسی ادویات سے مسہل لیتے رہے یہاں تک کہ بحمد للہ تعالیٰ دوڈھائی ماہ میں بالکل تندرست ہوگئے۔ لیکن اس حادثہ کے بعد گرمی کے موسم میں آپ کی جسم پر دانے نکل آئے اور تھوڑی گرمی بھی ناقابل برداشت ہوتی تھی۔

ایک بار فرمایا میں نے مغالطہ میں اتنی مقدار میں زہر کھالیا تھا کہ جو دس آدمیوں کو موت کی نیند سلانے کیلئے کافی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت حکیمؒ کو بڑا رعب عطا فرمایا تھا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ محلّہ کا ہی ایک چور آپکے مکان کی دیوار میں نقب لگانے لگا۔ جب ٹھک ٹھک کی آواز آئی تو حکیم صاحب نے اپنی بارعب آواز میں فرمایا کون ہے؟ چور ڈر گیا اور جھٹ پٹ بولا حضرت میں تھا ''برکت'' فرمایا۔ اچھا تیری یہ حرکت۔ چور تھا بھاگ کھڑا ہوا۔ دونوں بھائیوں یعنی حضرت حکیم نخومیاں صاحبؒ اور حاجی مصطفیٰ کامل صاحبؒ میں ان بن رہتی تھی۔ اسکے باوجود جب کبھی موقع ملتا۔ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔ میں دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ دونوں حضرات ایک دوسرے کے متعلق پوچھتے اور اعتراض کرتے۔ لیکن میں نے کبھی ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر نہیں لگائی۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو سخت سست کہا کرتے تھے۔ ایک بار حاضرین سے حکیم صاحبؒ نے فرمایا یہ لڑکا اچھی عادت کا ہے

چغلی نہیں لگاتا۔ آپ کی خدمت میں گنگوہ کی تمام اہم شخصیات حاضر ہوا کرتی تھیں۔ مدرسہ اشرف العلوم کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب نور اللہ مرقدہ۔ اور تمام اساتذہ کرام اور اطباء عزیز گاہے گاہے حاضر ہوکر فیضیاب ہوتے۔

پیر جی مقبول احمد صاحب حکیم شفیق احمد صاحب، حکیم جمیل احمد صاحب قاضی مسعود احمد صاحب عرف قاضی سودے خواجہ شبیہ الحسن عرف بھائی چھوٹے۔ مولوی ایوب صاحب مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ حکیم ضمیر احمد صاحب۔ حکیم لیاقت احمد صاحب شاہ جی درویش صاحب بھائی شفیع صاحب چھتے والے بھائی محی الدین صاحب چھتے والے جازی بھائی (شاہ اعجاز جہاں جو اس وقت خانقاہ میں بیٹھتے ہیں) سید نذیر احمد صاحب سید محمد حسن صاحب شہر گنگوہ کی تمام اجلہ شخصیات کی باقاعدہ ہفتہ دس دن میں ایک بار حاضری ضرور ہوا کرتی تھی۔ اب تو بہت سے نام بھی ذہن سے مفقود ہوگئے چالس سال پرانی بات ہوگئی غرض دور دور سے علمائے کرام اور محبین کرام آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر علمی تشنگی بجھاتے۔

صد سالہ جلسہ میں آپ نے شرکت نہیں فرمائی تھی۔ کیوں کہ اتنا بڑا اجتماع حکیم صاحب کی نظر میں غیر ضروری تھا۔ لیکن صد سالہ اجلاس کے بعد فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنیؒ نے محمود ہال میں ایک اہم اجلاس بلایا اور صرف آپ کی تقریر ہوئی تو علماء عش عش کررہے تھے کہ حکیم صاحب کا کیا علم ہے ایک ٹھاٹیں مارتا سمندر ہے جیسے آپ نازک تھے آپ کا لباس بھی ایسا ہی نفیس اور صاف شفاف بالکل سفید ہوا کرتا تھا۔ اور ترکی ٹوپی اور اونچی ایڑی کے کالے جوتے۔ آپ قد کے اعتبار سے تو یقیناً چھوٹے تھے لیکن علم کے اعتبار سے آپ ایسے قدآور تھے کہ کوئی آپ کی ہمسری نہیں کرسکتا تھا۔ جمعہ کی نماز ہمیشہ مولوی منظور احمد صاحب کی مسجد میں ادا کرتے تھے جو حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے تھے۔

غالباً ۱۹۷۱ء یا ۱۹۷۲ء میں حضرت ناظم صاحبؒ نے جامعہ اشرف العلوم کی نئی جگہ (موجودہ مقام) پر سیرت کا جلسہ منعقد کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند سے بھی علمائے کرام تشریف لائے تھے۔ آخری تقریر حضرت حکیم نھومیاں صاحبؒ کی تھی۔ مجھ جیسا کم علم اور کم فہم حضرت حکیم صاحبؒ کی تقریر کیسے نقل کرسکتا ہے۔ البتہ اس وقت طالب علمانہ ذہن کے مطابق یہ بات سمجھ میں آئی تھی کہ حکیم صاحبؒ کی تقریر سیرت رسولؐ پر تھی۔ اور حکیم صاحب سیرت کو قرآن کے آئینہ میں بیان فرمارہے تھے۔ مثلاً حضرت نے فرمایا تھا سورہ بقر حضور ﷺ کا سینۂ مبارک ہے اور اس پر خوب کلام فرمایا۔ پھر فرمایا طٰہٰ حضور ﷺ کی بنی مبارک ہے پھر اس پر خوب کلام فرمایا۔ پھر فرمایا حٰمٓ حضور ﷺ کے گوش مبارک ہیں پھر اس پر طویل کلام فرمایا۔ غرض تقریباً ۳ گھنٹہ کی طویل تقریر تھی جس میں مجمع دم بخود تھا۔ علمائے کرام محوِ حیرت تھے اس وقت حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا ارے چرتھاولی تیری سمجھ میں کچھ آیا ہے۔ میں نے عرض کیا حضرت ہم لوگ کیا سمجھ سکتے ہیں؟ تو شاہ صاحب نے فرمایا تو کیا سمجھتا ہماری سمجھ میں بھی پوری تقریر نہیں آئی۔ اللہ اکبر۔ بہر حال حکیم صاحبؒ ایک عظیم بحرالعلوم تھے۔ ایسا سمندر تھے جس کے ساحلی کنارے عام علماء کرام کی دسترس سے باہر تھے آپ کی دو شادیاں ہوئی۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح غالباً پور قاضی کے کسی خاندان میں ہوا مجھے اسکی تفصیلات کا علم نہیں۔ پہلی اہلیہ محترمہ سے دو صاحبزادیاں اور ایک فرزند غالباً ان کا نام ''قیصر'' تھا اجان نے ۱۹۷۴ء میں پاکستان کا سفر کیا بندہ سفر میں ساتھ تھا اس وقت شاید کراچی میں کسی مقام پر وہ اپنے چچا اجان صاحب سے ملے تھے تو میں نے بھی ان کو دیکھا تھا۔ دوسری اہلیہ محترمہ سے دو صاحبزادیاں ہیں۔ میں جس زمانہ میں گنگوہ رہتا تھا۔ اور حضرت حکیمؒ کی خدمت میں حاضری ہوتی تھی ان بچیوں کا لڑکپن کا زمانہ تھا۔

حکیم صاحبؒ نے طب حضرت مولانا حکیم عبدالوہاب صاحب نابینا انصاری دہلویؒ سے پڑھی تھی۔ حکیم نابینا حضرت گنگوہیؒ کے مرید اور عاشق تھے انتقال سے قبل وصیت کی تھی کہ مجھے حضرت گنگوہیؒ کے قدموں میں دفنایا جائے۔ چنانچہ ان کو حضرت گنگوہی کے مرقد کے پائینتی دفنایا گیا۔ (راقم الحروف اسی لئے حضرت حکیم مولانا نابینا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دادا استاد کہا کرتا ہے) حکیم نابنیا دہلویؒ نے بطورِ خاص حضرت حکیم نھومیاںؒ کو جواہر مہرہ بنا کر دیا تھا جو اس وقت ڈھائی سو گرام سے زائد تھا۔ حکیم صاحب جب بھی کسی مریض کو دوا دیتے تو اس میں چاول کے بقدر کھرچ کھرچ کر ہر ایک پڑیا میں ضرور شامل فرماتے۔ کہتے ہیں کہ آخیر عمر تک آپ کے استاد محترم کا عنایت فرمایا ہوا جواہر مہرہ کام آیا۔ اللہ تعالیٰ استاد اور شاگرد (حکیم نابینا دہلوی اور حکیم نھومیاں صاحب) پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے آمین!

بہر حال بھولی بسری یادیں حضرت حکیمؒ کے متعلق جو بندہ کے ذہن میں تھیں وہ لکھ دیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود عرف نھومیاں صاحبؒ کی قبر کو نور سے منور فرمائے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے، آمین ثم آمین یارب العالمین۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ .

☆☆☆

پیر طریقت قلندر زماں

مصطفیٰ کامل رشیدی اعرابیؒ [۱۳]

نبیرہ حضرت گنگوہیؒ خلیفہ ومجاز شیخ الاسلامؒ

حضرت شیخ عبد القدوس قطب عالم گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ دسویں صدی ہجری کے معروف ومشہور اولیاء اللہ میں سے ہیں شیخ عبدالقدوسؒ اپنے زمانہ کے مقبول اور ہر دل عزیز بزرگ تھے۔ سادگی آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ دنیا اور دنیا کی چیزوں سے بیزار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ گھر میں تشریف لائے اور بیوی سے فرمایا مجھے تو گھر میں سے دنیا کی بو آرہی ہے بیوی نے کہا گھر میں کیا رکھا ہے؟ دیکھ لو۔ آپ بار بار یہی فرماتے رہے، بیوی نے غصہ میں کہا لو یہ چند سیر ''جو'' میں نے چھپا کر رکھے تھے کہ بچوں کو بھوک میں پریشانی نہ ہو۔ آپ نے وہ جَو لئے اور خیرات کر دئے۔

آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے پانچ بیٹے عطا فرمائے اور پانچوں بحمد للہ تعالیٰ اپنے وقت کے قطب ہیں آپ کو اللہ تعالیٰ نے فنافی اللہ کا درجہ عطا فرمایا تھا۔ ایک بار سردی کے سخت موسم میں آپ نماز میں مشغول تھے، آپ کے خلیفہ ومجاز

[۱۳] ماخوذ: فیضان گنگوہی، مولف محمد ادریس حبان رحیمی، مطبوعہ رحیمی کتب خانہ بنگلور

حضرت مولانا جلال الدین تھانیسری نے آگ کی انگیٹھی لاکر پیچھے رکھدی، تاکہ حضرت کو سردی نہ لگے قطب عالم نے نماز کا سلام پھیر کر ارشاد فرمایا جلال الدین آج نماز میں مزہ نہیں آیا، پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو فرمایا اوہو، یہ انگیٹھی کیوں رکھدی اس کی وجہ سے نماز کا خشوع جاتا رہا۔ جس رات میں شیخ عبدالقدوس قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہوا اس رات میں حضرت نے ہر دو رکعت نفل تازہ وضو سے ادا فرمائی۔ جلال الدین تھانیسری فرماتے ہیں کہ اس رات میں ستر بار وضو فرمایا، انتقال سے تھوڑی دیر قبل حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا۔ حضرت کباب کی یعنی گوشت کے جلنے کی بو آرہی ہے۔ ارشاد فرمایا عبدالقدوس کا دل عشق خداوندی میں جل کر کباب ہو چکا ہے اور کچھ دیر بعد وصال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نسلوں میں بڑے بڑے اولیاء پیدا فرمائے۔ آپ کے نبیرہ شیخ ابوسعیدؒ بھی ہوئے ہیں جنکا مزار خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ کے باہر بنا ہوا ہے اس پر گنبد نہیں ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں جب بھی آپ کے مزار پر قبہ بنایا گیا خود بخود گر گیا اس لئے ابوسعیدؒ کے مزار پر گنبد نہیں ہے۔ جس زمانہ میں راقم الحروف (محمد ادریس حبان رحیمی) گنگوہ میں مقیم تھا، اس وقت یہ بات مشہور تھی کہ غیر مسلم اپنی میت شاہ ابوسعید کی درگاہ کے سامنے سے نہیں لیجاتے، اس لئے کہ آپ کی درگاہ کے سامنے سے غیر مسلم کی میت اگر گذر جاتی ہے تو اس میں آگ نہیں لگتی۔ واللہ اعلم (کیوں کہ غیر مسلم اپنی میت کو جلاتے ہیں)

آج سے ٹھیک 189 سال قبل ۱۲۴۴ھ میں 6 ذی قعدہ بروز پیر کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قصبہ گنگوہ محلّہ سرائے متصل خانقاہ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ میں پیدا ہوئے۔ آپ والدہ کی طرف سے عبدالقدوسؒ گنگوہی کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عبدالغنی مجددی المتوفی ۱۲۹۶ھ سے علم حدیث حاصل کیا اور حضرت گنگوہیؒ کو مولانا قاسم نانوتویؒ کے وصال

کے بعد دارالعلوم دیوبند کا سرپرست بنایا گیا۔ حضرت گنگوہیؒ کو بطلِ حریت حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت ورشاد اور خلافت کا شرف حاصل ہے۔ حضرت گنگوہیؒ حضرت حاجی صاحب کے حکم سے خانقاہ قدوسیہ میں مسند پر تشریف فرما ہوئے، اس وقت شیخ کی خانقاہ بالکل ویران ہوچکی تھی۔ دھوبیوں نے اصطبل بنالیئے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ نے اپنے ہاتھوں سے خانقاہ کو صاف کرکے از سرنو آباد کیا۔ پھر اپنے خرچ سے سہ دری کی تعمیر کرائی گویا خانقاہ پھر سے تین سو سال بعد آباد ہوگئی۔ حضرت گنگوہی فقہ وحدیث کے امام تھے یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ آپ کو ابوحنیفۂ عصر کہا کرتے تھے۔ (ذکر طیب ص ۳۶)

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ جیسا بلند پایہ محقق ومحدث جو علامہ شامی کو ''فقیہ النفس'' کا مرتبہ دینے کے لئے تیار نہ تھے مگر وہی حضرت گنگوہی کو فقیہ النفس فرمایا کرتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس زمانہ کے نیک، متقی اور باصلاحیت علماء کرام آپ کے حلقہ میں بڑی تعداد میں شامل ہوگئے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب پنجاب سے اپنے پچاس خلفاء کے ساتھ جمنا میں بغیر کشتی کے پانی پر مصلہ بچھا کر آسانی سے عبور کرکے لکھنوتی میں اتر گئے اور وہاں سے پیدل چل کر آپ کی خدمت میں پہونچے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا میرے یہاں ایسے شعبدے بازوں کی گنجائش نہیں ہے۔ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب نے معذرت چاہی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو بیعت کی اجازت مرحمت فرمائی اور اپنا خلیفہ بنایا اور فرمایا یہ پچاس مریدین وخلفاء بھی آپ ہی کے ہیں ان کو ساتھ لیجائیں۔ بعد میں یہی مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری کے نام سے معروف ہوئے ان کے قدموں سے رائے پور کی خانقاہ بنی اور آباد ہوئی، ان کے خلیفہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری تھے۔ مولانا گنگوہی کے

خلفاء میں حضرت مولانا مرتضی حسن چاندپوری بھی تھے جن کو اللہ تعالیٰ مستجاب الدعوات بنایا تھا، انہوں نے حضرت گنگوہی کی اجازت سے دعائے سیف کا عمل کیا تھا، ایک بار خواب دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں تلوار ہے اور اسکی دھار پر مکھی بیٹھی ہے انہوں نے اسکو اڑانا چاہا تو انگلی تلوار کی دھار پر لگ گئی، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ انگلی سے سچ مچ خون جاری ہے حضرت گنگوہی سے اس کا تذکرہ کیا، فرمایا تمہارا عمل مکمل ہوگیا ہے اب تم جو بھی دعا یا بددعا کروگے لوگوں کے حق میں قبول ہوگی اس لئے اب بستی میں نہیں جنگل میں جاکر رہو، ایسا نہ ہو کہ کسی کو بددعا کردو اور اسکا نقصان ہوجائے، کہتے ہیں کہ مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری بستی سے باہر جھوپڑی میں رہا کرتے تھے۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ بھی حضرت گنگوہی کے خلفاء میں سے ہیں، حضرت گنگوہی فرمایا کرتے تھے، محمود الحسن تو علم کا کُٹھلا ہیں، شیخ الہند کی زندگی سے ثابت ہوگیا کہ حضرت نے ریشمی رومال تحریک اور پھر مالٹا کی جیل میں قید وبند کی صعوبتیں کیسی پامردی سے برداشت کیں اور دارالعلوم دیوبند کی داغ بیل ڈالنے اور اس کی آبیاری میں کس طرح سے شریک رہے۔ ایسے ہی ایک خلیفہ تھے حضرت گنگوہی کے، جنکا نام تھا مولانا محمد صدیق انبیٹھویؒ نہایت سادہ مزاج تھے ایک بار فجر کی نماز میں پگڑی باندھ کر آئے نماز کے بعد کسی نے پوچھا حضرت آپ کی پگڑی میں ناڑہ لٹک رہا ہے تو دیکھ کر فرمایا اوہو یہ بھول سے منظور احمد کی والدہ کا پائجامہ باندھ کر آگیا ہوں ان کے بارے میں حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا مولانا صدیق کی زلف کی لٹیں میری قبر کی روشنی ہیں۔ سبحان اللہ۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی سہارنپوریؒ بھی حضرت گنگوہی کے خلیفہ ومجاز ہیں جو اپنے وقت کے جلیل القدر محدث اور مہاجر مکی تھے۔ نہایت سادگی سے اپنی فیملی کے ساتھ مکہ میں زندگی گذاری۔ آپ کے علم وفضل کا مکہ اور مدینہ میں شہرہ تھا۔ سعودی حکومت قائم ہوئی تو سب سے پہلے

فرماں روا شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے ملک سعودی عرب کے تمام علماء اور اکابر و مشائخ کی خدمت میں تحائف ارسال کئے، سب نے بادشاہ کے تحائف قبول کئے اور شکریہ ادا کیا، لیکن مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے تحفہ واپس کر دیا اور قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ بادشاہ کے مقربین میں سے کسی نے عرض کیا کہ یہ ہندی عالم ہیں آپکے ملک میں رہتے ہیں اور آپ کا تحفہ لینے سے منع کر رہے ہیں؟ کیسے احسان فراموش ہیں؟ بادشاہ نے کہا ایسا مت کہو۔ میری سلطنت میں اگر کوئی واقعی عالم کہلانے کے لائق ہے تو صرف شیخ خلیل ہی ایسی ہستی ہیں جن کو عالم دین اور فضیلۃ الشیخ کہا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے تمام علماء اور مشائخ کی ضیافت کی اور اپنے محل میں قدم رنجا ہونے کی درخواست کی سب کو دعوت نامے ارسال کیے مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو بھی دعوت نامہ پہونچایا گیا۔ آپ بھی وقت پر بادشاہ کے محل پر پہونچے جیسے ہی بادشاہ کو معلوم ہوا کہ شیخ خلیل احمد آرہے ہیں محل کے دروازے پر پہونچ کر آپ کا استقبال کیا اور اپنے برابر والی کرسی پر آپ کو بٹھایا۔ اور عرض کیا۔ مجھے آپ سے کچھ معلومات کرنا ہے اگرچہ میں آپ کے دولت خانہ پر حاضر ہو کر بھی دریافت کر سکتا تھا، لیکن یہاں سب کے سامنے اس لئے معلوم کر رہا ہوں تا کہ تمام حاضرین کی معلومات میں اضافہ ہو جائے۔

حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا دریافت کیجئے۔ بادشاہ نے پوچھا، آپ نے میرا تحفہ قبول کیوں نہیں کیا تھا حضرت نے فرمایا، آپ بادشاہ ہیں اور بادشاہ ملک کا مالک نہیں بلکہ ملک کا اور ملک کے مال و دولت کا امین ہوتا ہے۔ آپ نے جو تحفہ بھیجا وہ ملک کے مال سے ہے اس لئے میں نے تحفہ قبول نہیں کیا۔ کیوں کہ بادشاہ صرف امین ہے مالک نہیں اس لئے اس کا لینا میرے لئے جائز نہیں تھا۔ دوسرا سوال بادشاہ نے کیا جیسے آپ نے تحفہ قبول کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ایسے ہی آپ

دعوت قبول کرنے سے بھی منع کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے دعوت قبول کی اور بنفسِ نفیس تشریف بھی لے آئے۔ اسکا کیا جواز ہے؟

حضرت سہارنپوریؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا، آپ نے حاضری کا حکم دیا، کیوں کہ آپ ملک کے امیر ہیں اور امیر کی اطاعت لازمی ہے اسلئے حاضر ہو گیا ہوں۔ بادشاہ نے تمام حاضر علماء اور مشائخ سے فرمایا، میں نے شیخ خلیل کو یہاں آنے کی زحمت اسلئے دی کہ آپ بھی شیخ کی بات سن لیں، چنانچہ حضرت سہارنپوریؒ کے کلام اور آپ کے تقویٰ سے تمام حاضرین متأثر ہوئے، اور آپ کی فضیلت کے قائل ہو گئے۔ بادشاہ نے ازراہِ عقیدت پوچھا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیں تا کہ تعمیل کی جائے۔ شیخ نے فرمایا میں شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ملک کے بلد امین میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ ایک گذارش ہے اگر قبول فرما لیں؟ بادشاہ نے توجہ کے ساتھ کہا ضرور ضرور فرمائیے، کیا گذارش ہے؟

حضرت نے فرمایا، حرمین شریفین میں یعنی حرم مکہ میں اور حرم مدینہ میں اذان کے فوراً بعد جماعت کھڑی ہو جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم لوگ حنفی المسلک ہیں اذان کے بعد چار رکعت سنت موکدہ ہمارے یہاں ہے۔ ہمیں اسکا وقت نہیں ملتا اور نماز کھڑی ہو جاتی ہے اس لئے اذان کے بعد سنتوں کے لئے وقفہ رکھنے کا حکم جاری فرما دیں، بادشاہ کو خوشی ہوئی کہ شیخ خلیل نے اپنے لئے تو کچھ بھی طلب نہیں کیا۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم جاری کر دیا کہ جب تک سلطنت سعودی قائم رہے گی اس وقت تک پانچوں وقت کی اذان کے بعد سنتوں کیلئے وقفہ دیا جائے گا۔ میں راقم الحروف (محمد ادریس حبان رحیمی) اکثر کہا کرتا ہے کہ حرمین شریفین میں اذان کے بعد سنتوں کا وقفہ بھی علمائے دیوبند کا طفیل ہے۔ خانقاہ قدوسیہ کے ساتھ جب تک حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نہ ہو تو یہ ذکر ادھورا ہی رہے گا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف العلوم علی

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (جو میرے دادا پیر بھی ہیں) علمائے دیوبند کے سرخیل ہیں آپ نہ صرف مجدد الملت اور حکیم الامت ہیں بلکہ آپ اپنے وقت کے محقق اور فقیہ بھی ہیں آپ کو حضرت تھانوی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، حاجی صاحب نے فرمایا بیعت میں نے کرلیا۔ مگر اصلاح مولوی رشید احمد گنگوہی کے ذمہ ہے اور اس طرح حضرت تھانوی حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر تربیت آ گئے۔ دنیا نے دیکھا حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سچے موتی کو کیسے نکھارا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی مجلس ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں نم آنکھوں سے حضرت تھانوی یہ نہ فرماتے ہوں ''میرے شیخ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ'' فرماتے تھے (سبحان اللہ ایسی مثالی محبت تھی اپنے شیخ سے حضرت حکیم الامت کو) ایک مرتبہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ میں جمع تھے۔ حضرت گنگوہی نے ارشاد فرمایا، بتایئے آپ حضرات میں سے کون ایسا ہے جو نماز پڑھا دے (نماز پڑھانے سے مراد صحابہ کرام جیسی نماز تھی) حضرت تھانوی نے عرض کیا حضرت نماز پڑھا تو نہیں سکتا، البتہ نماز پڑھ سکتا ہوں، اس پر امام ربانی نے فرمایا، الحمدللہ میری جماعت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو نماز پڑھ سکتے ہیں اور جو پڑھ سکتے ہیں وہ پڑھا بھی سکتے ہیں!

بانی تبلیغی تحریک حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا بچپن بڑے بھائی حضرت مولانا محمد یحییٰ کے ساتھ ایک عرصہ تک حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گذرا، اور بیعت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ تربیت بھی حضرت گنگوہیؒ نے فرمائی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ نے امام ربانی حضرت گنگوہیؒ سے عرض کیا میرا دل صرف نماز میں لگتا ہے باقی اوراد و وظائف میں دل نہیں لگتا۔ بس دل چاہتا ہے کہ نماز پڑھتا رہوں، حضرت گنگوہی نے بشارت دی، اللہ تعالیٰ تم سے دین کی کوئی اہم خدمت لیں گے۔

حضرت گنگوہیؒ کے وصال کے بعد مولانا الیاسؒ نے دعوت و تبلیغ کی تحریک شروع کی۔ جو آج تمام عالم میں جاری ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے کون واقف نہیں ملک و ملت کے لئے آپ کی قربانیاں اظہر من الشمس ہیں۔ آپ بھی حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ و مجاز ہیں۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کو خاص نسبت تھی۔ امام ربانی اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے شاملی کے میدان میں انگریز فوج سے لوہا لیا اور ان کے قلعہ کو فتح کرلیا تھا۔ اسی میں حافظ ضامن بھی شہید ہوگئے تھے۔ انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کے لئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی عمر کا کافی حصہ جیلوں میں گذرا۔ ملک آزاد ہونے کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث سنبھال لیا اور کم و بیش آخری ایام تک اسی میں مشغول رہے، اس دوران آپ نے سالکین کی ایک بڑی جماعت تیار کی، ہمیشہ مدارس کے اسفار بھی رہتے اور سیاسی و دینی اجلاس بھی۔ لیکن بخاری شریف کے درس اور سالکین کی تربیت سے کبھی غافل نہیں رہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا شیخ محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اعتراض کیا آپ صرف اجلاس اور اسفار میں رہتے ہیں۔ بیعت ہونے والوں کی تربیت نہیں کرتے حضرت مدنیؒ نے شیخ کو دیوبند بلایا اور اپنا صندوق کھول کر سالکین کے خطوط دکھائے، جن کو پڑھ کر شیخ حد درجہ متاثر ہوئے اور کہا ایسی تربیت اور خبر گیری تو ۲۴ گھنٹہ خانقاہ میں رہنے والا بھی نہیں کرسکتا۔ اور معذرت چاہی کہ مجھے آپ کی اس خدمتِ عالیہ کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ شیخ الاسلامؒ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضرت گنگوہیؒ کے صاحبزادے حضرت مولانا مسعود احمد صاحبؒ کے دوسرے صاحبزادے حضرت حاجی مصطفیٰ کامل صاحبؒ آپ سے بیعت ہوئے آپ نے ان کی تربیت فرمائی۔ اور پھر ان کو حضرت گنگوہیؒ کی خانقاہ میں بٹھایا۔

ٹھیک حضرت گنگوہیؒ کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعود احمد صاحب کے گھر میں ایک فرزند کی ولادت ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا ایک انقلاب کی طرف بڑھ رہی تھی ہندوستان میں انگریزوں کا بول بالا تھا اور دیگر ممالک میں بھی کسی نہ کسی قسم کے انقلابات سے عوام نبرد آزما تھے۔اس فرزند کا نام مصطفیٰ کمال رکھا گیا۔جو بعد میں مصطفیٰ کامل ہوگیا۔اس زمانہ میں مصر کے مصطفیٰ کمال پاشاہ کی شہرت تھی اسی بناء پر یہ نام رکھا گیا تھا۔اس فرزند کی تعلیم اس زمانے کے اسکول میں ہوئی اور مدرسہ میں بھی داخل کرایا لیکن فارسی عربی کی مختصر طور پر کچھ کتابیں پڑھیں۔کیونکہ تعلیم سے اس فرزند کو زیادہ دل چسپی نہیں تھی لیکن گھر کا ماحول دینی اور مذہبی تھا۔

حضرت گنگوہیؒ کی زندگی کے نقش ابھی اس گھر میں باقی تھے اور آس پاس خانقاہی اور مذہبی ماحول تھا، کیونکہ حضرت گنگوہی کے صاحبزادے مولانا حکیم مسعودؒ نے حضرت گنگوہی کی گود میں تربیت پائی تھی۔دہلی سے درس نظامی اور فنِ طب پڑھ کر گنگوہ میں مطب کررہے تھے۔گویا حضرت گنگوہیؒ کے مطب کو آپ نے سنبھال لیا تھا۔ابھی یہ فرزند پوری طرح لڑکپن سے باہر نہیں نکلا تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا یعنی مولانا حکیم مسعود احمد صاحب انتقال فرما گئے۔آپ کی والدہ نے اس فرزند کی تربیت کی بڑے بھائی عبدالرشید محمود عرف ننومیاں کو دارالعلوم دیوبند میں داخل کرادیا گیا۔اور والد کے انتقال سے کچھ دن پہلے وہ فارغ ہوکر گنگوہ واپس آگئے تھے۔اسی لئے حکیم مسعود صاحب نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا میں ایک بینا اور مخلص بیٹے کو تمہارے پاس چھوڑ کر جارہا ہوں چناں چہ ان کی دیکھ ریکھ میں مصطفیٰ کامل صاحب کا بچپن گذرا۔شادی کے بعد حضرت مدنیؒ سے بیعت ہوگئے۔آپ اپنے وقت کے فیشنبل نوجوان تھے۔جو دیکھتا کچھ دیر کیلئے مبہوت ہوجاتا۔دہلی میں کچھ دنوں ملازمت کی اسی دوران ان کی خوبصورتی کو دیکھ کر فلم انڈسٹری کے لوگ ان کے پیچھے پڑ

گئے اور بار بار ترغیب دلائی کہ آپ ایک اچھے اداکار بن سکتے ہیں۔لیکن انہوں نے ہر مرتبہ ان سے معذرت چاہتے ہوئے یہی کہا کہ میری رگوں میں مولانا گنگوہی کا خون ہے میں اسکو ناپاک نہیں کرسکتا۔بیعت ہونے کے بعد زندگی میں انقلاب آیا، اور چہرے پر داڑھی اور سر پر عمامہ سجالیا، اور حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ساتھ جماعت کے کام میں لگ گئے۔خانقاہ میں بھی جماعتوں کا سلسلہ جاری رہا۔اور چھوٹے بڑے اجتماعات میں شرکت کرتے رہے حضرت جی مولانا محمد یوسف صاحبؒ آپ سے بڑی محبت کرتے اور ہر اجتماع میں آپ کو خطاب کا موقع دیا جاتا۔حضرت کے انتقال کے بعد آپ پر تصوف کا غلبہ ہوگیا۔اور پھر چلّہ کشی میں لگ گئے حضرت گنگوہیؒ کے مزار پر جو مسجد بنی ہے اس میں زیادہ وقت گذرتا، اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔گھر سے کھانا پینا منگالیا جاتا۔اور پوری توجہ سے حضرت مدنیؒ کی تعلیم وتربیت کے مطابق راہِ سلوک میں لگے رہتے۔اور بار بار دیوبند حضرت مدنیؒ کی خدمت میں حاضری دیتے، حضرت مدنیؒ آپ کی آمد سے بہت زیادہ خوش ہوتے اور گھر میں رونق آجاتی۔

ایک بار حضرت مدنیؒ نے ارشاد فرمایا جب آپ آتے ہیں تو میرے گھر کے بچے بچے کی زبان پر ہوتا ہے بھائی کامل، بھائی کامل، کئی کئی دنوں تک الحاج مصطفیٰ کامل صاحب المعروف اجّان صاحب کا قیام حضرت مدنیؒ کے پاس رہتا تھا۔اور حضرت علیہ الرحمہ اندر مکان میں بلا کر بٹھاتے اور بڑی خاطر داری فرماتے۔

ایک مرتبہ اجان صاحب دیوبند حاضر ہوئے۔دیکھا کہ حضرت مدنی لال جوتے پہنے ہوئے ہیں۔اجان نے ازراہِ محبت وعقیدت عرض کیا حضرت لال جوتے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔حضرت مدنیؒ نے مسکرا کر فرمایا اچھا اچھا بوڑھی گھوڑی لال لگام، تھوڑی دیر کے بعد حضرت اندر مکان سے واپس ہوئے تو کاغذ میں کچھ لپیٹ

کرلائے اور فرمایا لیجئے کامل صاحب یہ آپ کیلئے ہیں۔ کھول کر دیکھا تو وہی لال جوتے جو حضرت نے پہنے تھے۔ اجان نے عرض کیا حضرت یہ جوتے آپ کے پاؤں مبارک میں زیادہ اچھے لگتے ہیں لیکن حضرت نے فرمایا آپ ان کو ضرور پہنیں۔

کئی سال خوب مجاہدات اور ریاضات کے بعد حضرت مدنیؒ نے آپ کو اجازت نامہ (یعنی خلافت نامہ) بذریعہ پوسٹ کارڈ لکھ کر ارسال فرمایا، جو اجان کے پاس تھا راقم الحروف کو بھی کئی بار اسے پڑھنے کا موقعہ ملا اس میں لکھا تھا کہ میں آپ کو سلسلہ اربعہ میں اجازت دے رہا ہوں۔ آپ بیعت کیا کریں۔

اجان کی والدہ نے اور پھر آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا حکیم عبد الرشید محمودؒ نے بھی خلافت کے تعلق سے حضرت مدنیؒ سے تحقیق کی تو فرمایا ہاں ہاں میں نے ہی کامل صاحب کو اجازت دی ہے۔

حضرت مدنیؒ کے وصال کے بعد کسی نے اجان کی خلافت پر اعتراض کیا، تو آپ کی والدہ نے حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری کو خط لکھا اس کے جواب میں حضرت نے جو خط لکھا تھا راقم الحروف نے وہ خط بھی پڑھا ہے اس میں حضرت رائے پوریؒ نے لکھا تھا کامل صاحب، خلافت کے مستحق ہیں اور میں بھی اپنی طرف سے اجازت دیتا ہوں کہ وہ طالبین کو بیعت کریں۔ حج کیلئے اجان تشریف لے گئے۔ تو حرم شریف میں دیگر اکابرین کے علاوہ حضرت علامہ ابراہیم بلیاویؒ سے ملاقات ہوئی آپ کی خلافت کو نہ صرف انہوں نے تسلیم کیا بلکہ اپنی پگڑی اتار کر اجان کے سر پر باندھی اور فرمایا آپ خلافت کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ چند سطور میں نے ان لوگوں کیلئے تحریر کردیں جن کو اجان کی خلافت پر شک وشبہات ہیں، بہر حال اجان اپنے زمانہ کے صاحب نسبت بزرگوں کے سچے جانشین تھے۔ اور خود بھی صاحب نسبت تھے حسب ونسب سے بھی اور روحانی سلسلوں کے اعتبار سے بھی۔

شاید بہت سے لوگوں کے لئے حیرت کا باعث ہو۔ کہ حضرت مدنیؒ اپنے مریدین میں سے جس کو اجازت خلافت عطا فرماتے اسکو چلہ کشی کے لئے خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ بھیجا کرتے۔ اور ان کی نگرانی حضرت مولانا الحاج مصطفیٰ کامل رشیدی اعرابی عرف اجان کے سپرد ہوتی۔ جب آنے والے کا وقت پورا ہوجاتا اور وظائف مکمل ہوجاتے تو اجان حضرت مدنیؒ کی خدمت میں خط لکھتے کہ فلاں صاحب کے حالات اور معمولات قابل اطمنان ہیں تو حضرت اسکو خلافت سے نوازتے۔ ایسے کئی افراد کے نام مجھے (راقم الحروف) کو معلوم ہیں جنہوں نے اپنے اوراد و وظائف صحیح طور پر پورے نہیں کئے۔ اور اجان نے ان کو خط لکھ کر نہ دیا تو شیخ الاسلام نے دوبارہ ان کو چلہ کشی کے لئے گنگوہ روانہ فرمایا، تا آں کہ اجان کا خط لے کر واپس ہوئے تو خلافت سے سرفراز کیا گیا۔ ایسے ایک دو یا دو چار خلفاء نہیں، ڈیڑھ سو خلفاء میں سے 80 خلفاء کو، اجان کی طرف سے اطمینان معلوم ہونے پر حضرت مدنیؒ نے خلافت سے نوازا۔ شاید یہ بات بہت سوں کو ناگوار ہو کہ شیخ الاسلامؒ کے وصال کے بعد جب آپ کے ڈیڑھ سو خلفاء کی فہرست تیار کر کے مدنی منزل کے ہال میں حضرت شیخ الاسلامؒ کی مسند شریف کے اوپر فریم کر کے لگائی گئی تو اس فہرست میں حضرت مدنیؒ کے لاڈلے خلیفہ حضرت مولانا الحاج مصطفیٰ کامل صاحبؒ کا نام نامی نہیں تھا۔ اور اسی وجہ سے وہ یعنی اجان حضرت فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنیؒ سے ناراض تھے ان کا کہنا تھا کہ میرا نام عمداً شامل نہیں کیا گیا۔

ایک مرتبہ فدائے ملت گنگوہ تشریف لائے شیخ عبد القدوس قطب عالمؒ کے مزار پر حاضری دے کر اجان کی رہائش گاہ (یعنی خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ کے دروازہ) پر تشریف لائے اور اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے بعد فرمایا اسعد حاضر ہے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ اجان نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ دروازے کی جالیوں میں سے

فرمایا۔ وعلیکم السلام۔ میں آپ سے ناراض ہوں ملاقات نہیں کرسکتا میرا دل دکھا ہوا ہے میرا آپ کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ (راقم الحروف کے نزدیک دونوں ہستیاں مقدس ہیں اس لئے کسی کو گھٹا بڑھا کر پیش کرنا میرا مقصد نہیں بلکہ جو دیکھا اور سنا وہ من وعن لکھدیا) اللہ تعالیٰ ان دونوں باکمال شخصیات پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ آمین! اجان نے اس وقت ایک جملہ یہ بھی فرمایا تھا اسعد تم احسان فراموش ہو۔ فدائے ملت کے جانے کے بعد میں نے دریافت کیا۔ وہ احسان فراموش کیسے ہیں؟ تو اجان نے بتایا کہ شیخ الاسلامؒ نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور بتایا کہ اسعد کو میں نے اجازت دی ہے کہ وہ سیاست میں قدم بڑھائیں۔ آپ ان کا ساتھ دیں۔ تو میں نے بھی کھدّر کے کپڑے سلوائے۔ اور جہاں بھی سیاسی سماجی پروگرام ہوتے، کانگریس کے اسٹیج پر، میں مولانا اسعد مدنیؒ کو ساتھ لے کر جاتا کم وبیش ایک سال سے زائد عرصہ تک میں مولانا اسعد مدنی کے ساتھ رہا۔ اور ان کا تعارف کراتا، کیوں کہ میرا تعلق حضرت گنگوہیؒ کے گھرانے سے ہے اس لئے خوب پذیرائی ہوئی۔

جب مولانا اسعد مدنیؒ کے قدم جم گئے۔ اور ان کو سیاسی سماجی پلیٹ فارم پر خوب بولنا آ گیا اور ان کا تعارف بھی اچھا خاصا ہوگیا تو میں واپس خانقاہ میں گوشہ نشین ہوگیا۔ تو اجان نے کہا میں اسعد کو اس لئے احسان فراموش کہا، کہ میں نے ان کو عوام تک پہونچانے کے لئے جو تکلیف اٹھائی اور دن رات ساتھ دیا تھا اسکا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔ اجان صاحب کو اجان کیوں کہتے ہیں؟ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ آپ کے بڑے بیٹے شبلی صاحب جب چھوٹے تھے تو ابا جان کے بجائے ان کی زبان سے اجان نکلتا تھا گویا یہ ابا جان کا مخفف ہے اس لئے سبھی نے اجان کہنا شروع کردیا اور آپ زیادہ تر اسی نام سے معروف ہوگئے۔ اجان کا مزاج صاف ستھرا تھا۔ ظاہر وباطن بالکل صاف صاف۔ جو زبان پر ہوتا وہی دل میں اور جو دل میں ہوتا وہی

زبان پر، یہی وجہ ہے کہ ہمارے بہت سے اکابر علماء کرام کو ان کی صاف باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ شیخ زکریا صاحبؒ جب ہجرت کی نیت سے مدینہ منورہ جارہے تھے ہزاروں افراد حضرت سے ملاقات کے لئے جارہے تھے۔ شیخ کو اللہ تعالیٰ نے عجیب مقبولیت عطا فرمائی تھی جہاں بھی جاتے گلی کوچے بھر جاتے اور شیخ کی زیارت کے لئے مخلوق امڈ پڑتی۔ اسی دوران گنگوہ تشریف لائے۔ اور فرمایا بھائی کامل سے ملنا ہے۔ اطلاع کریں۔ میں نے اطلاع دی کہ شیخ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دروازہ کھولدیا، شیخ کی پالکی اندر لے آئے۔ اجان نے پوچھا، آپ نے جو ہجرت کا ارادہ کیا ہے کیا حضور ﷺ نے حکم دیا ہے کہ آپ ہجرت کریں؟

شیخ نے فرمایا: نہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں نے ۲۰ سال قبل ہجرت کا ارادہ کرلیا تھا اور مدینہ میں مقیم بھی ہوگیا تھا اسوقت حضور ﷺ نے خواب میں ارشاد فرمایا۔ زکریا ہندوستان واپس جاؤ۔ اور درس بخاری دو۔ سو میں اس وقت حکم کے مطابق ہندوستان آ گیا تھا۔ اور حدیث کا درس شروع کردیا تھا۔ اب بڑھاپا آ گیا ہے۔ اس قابل نہیں ہوں کہ درس کا سلسلہ جاری رکھ سکوں۔ اس لئے میں ہجرت کررہا ہوں۔ تاکہ آخری ایام دیار رسول میں گذر جائیں۔ تو اجان بڑی بڑی باتیں بڑے بڑے لوگوں سے بڑی آسانی سے معلوم کرلیا کرتے تھے۔

خانپور میں احمد العلوم ایک بڑا مدرسہ ہے۔ وہاں کا سالانہ جلسہ تھا۔ اس کے مہتمم مولانا بہاؤ الدین قاسمی صاحبؒ اجان کے خلفاء میں سے تھے۔ انہوں نے جلسہ میں حضرت مسیح الامت جلال آبادیؒ اور قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا فخر الحسنؒ اور دیگر اکابر علماء کے ساتھ حضرت مولانا الحاج مصطفیٰ کامل صاحب المعروف اجان صاحب کو بھی دعوت دی۔ اجلاس شروع ہونے سے قبل رات کا کھانا چنا گیا۔ سبھی حضرات دسترخوان پر موجود تھے۔ اجان نے مہتمم صاحب کو بلایا اور پوچھا، دسترخوان

پر اتنے عمدہ اور لذیذ کھانے چنے گئے ہیں کیا یہی کھانے عوام کو بھی کھلائیں گے۔؟ انہوں نے جواب دیا۔نہیں بلکہ ان کے لئے سادی پلاؤ جو سامنے ہی رکھی تھی۔اشارہ کر کے بتایا کہ یہ کھلائی جارہی ہے۔تو اجان نے دسترخوان پر موجود اکابر حضرات سے پوچھا۔عوام کے خون پسینے کی کمائی سے چندہ میں آئے ہوئے روپیوں سے یہ مرغن غذائیں آپ حضرات کیلئے تیار کی گئی ہیں یہ آپ کیلئے کیسے جائز ہوسکتا ہے۔کہ آپ تو مرغن غذائی کھائیں اور عوام کو گلا گھوٹنی (یعنی صرف پلاؤ) کھلائیں۔اور یہ کہہ کر دسترخوان سے اٹھ گئے۔آپ کے ساتھ حضرت مسیح الامتؒ بھی اٹھ گئے۔کہ کامل بھائی نہیں کھارہے ہیں۔گو ان دونوں حضرات نے وہی سادی پلاؤ کھائی اور جلسہ میں شرکت کر کے رات میں ہی رخصت ہوگئے۔باقی حضرات نے دسترخوان پر چنا گیا کھانا ہی نوش فرمایا۔(بہر حال اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا حال ہے) خانقاہ میں جو سب کیلئے پکتا تھا وہی اجان بھی کھاتے تھے۔اپنے لئے کبھی مخصوص سالن یا کھانا تیار نہیں کراتے تھے۔حالانکہ رمضان میں ہر پیر اور جمعرات کو کئی دیگیں زردہ پلاؤ کی تیار ہوتیں سب کے ساتھ آپ بھی وہی نوش فرماتے تھے۔

مزاج میں نفاست زیادہ تھی۔ دراصل یہ حضرت گنگوہیؒ کی طرف سے طبیعت میں نفاست ملی تھی۔آپ کو ہر چیز سفید پسند تھی۔ دیواروں اور دروازوں پر بالکل سفید رنگ روغن کراتے۔ پلنگ کے پائے اور پٹیاں بھی سفید اور چادر تکیہ بھی سفید ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ پاندان کا رنگ بھی سفید ہوتا۔لباس بھی سفید جوتے بھی سفید، کھڑاؤں بھی سفید، قالین اور فرش بھی سفید ہی ہوا کرتے تھے۔ جب کبھی باہر سفر کرتے تو خصوصیت سے سفید کار کا ہی انتخاب فرماتے۔ پگڑی اور عبا گرمیوں میں سفید ہوتی اور سردیوں میں کالی ہوا کرتی۔ کالا عمامہ نہایت نفیس ہوتا تھا۔فرماتے یہ عمامہ مولانا ابراہیم بلیاویؒ نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔لباس شاہانہ ہوتا تھا۔عوام تو کیا

خواص بھی آپ کی حرص نہیں کر سکتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے چہرہ مہرہ اور وضع قطع بھی ایسی شاہانہ بنائی تھی کہ لوگ دیکھ کر دنگ رہ جاتے میرے پاس اس زمانہ کی چند تصاویر ہیں۔آج بھی لوگ دیکھتے ہیں تو حیران ہوجاتے ہیں کیسی نفاست ہے۔؟

مہمان نوازی خوب کرتے تھے۔اپنے غریب اور نادار مریدین کو خوب سہارا لگاتے تھے۔ مالداروں کو خوب ڈانٹتے تھے کبھی ان سے مرعوب نہ ہوتے اور نہ ہی چاپلوسی کرتے تھے۔اس زمانہ میں حاجی مستان جو ہندوستان کا مشہور مالدار آدمی تھے۔وہ بھی اجان کے معتقد تھے۔لیکن کبھی ان کے ساتھ نرمی سے گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ حالانکہ حاجی مستان اور اس کے کئی دوست احباب جو اسمگلر کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔ اجان کے خاص مرید تھے لیکن اجان کی غیور طبیعت نے کبھی ان کے سامنے اپنی مجبوری ظاہر نہیں کی۔ فلمی دنیا کے لوگ بھی اجان سے ملنے آتے۔ایک بار یوسف خان (دلیپ کمار) ان کی اہلیہ سائرہ بانو ان کی والدہ نسیمہ صاحبہ اور دیگر لوگ آئے تو خوب تواضع کی۔ ہدیہ پیش کیا تو قبول نہیں فرمایا۔ دعائیں دے کر رخصت کر دیا۔مہمانوں پر خوب خرچ کرتے۔حتیٰ کہ بعض دفعہ دودھ والے کے دس ہزار روپے دکان والے کے پچیس ہزار روپے۔ کپڑے والے کے دس بارہ ہزار روپے۔گوشت والے کے بیس ہزار روپے قرض ہوجاتے۔لیکن جب آپ کے پاس رقم آتی تو رات میں بارہ بجے کبھی ایک بجے نیند سے اٹھا اٹھا کر قرض ادا کر دیا کرتے تھے۔فرماتے پیسہ آگیا۔جسکا دینا ہے پہلے ادا کردوں تو اچھا ہے۔ پیسے سے ان کو محبت نہیں تھی دونوں ہاتھوں سے خوب خرچ کرتے تھے۔

اجان نے پیسہ کبھی صندوق اور تالے میں نہیں رکھا۔ایک کتاب کے نیچے رقم رکھی رہتی تھی اور مجھے یا ایک دو خاص مریدین تھے ان کو کہتے کہ اتنے روپئے اٹھا کر لے آؤ لاتے اور خرچ ہوتے۔کبھی ان کو یہ فکر نہیں ہوتا تھا کہ رقم ختم ہوگئی تو کیا ہوگا؟

ایمان داری گھٹی میں پڑی تھی۔ تھوڑا سا بھی چھل فریب پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ حج پر جارہے تھے۔ گنگوہ کے کسی حاجی نے آپ کے پاس چار ہزار روپے امانت رکھدی۔ سمندر کے جہاز سے سفر کررہے تھے۔ آپ نے وہ امانت اپنے صندوق میں رکھدی۔ جب مکّہ پہونچے اور صندوق کھول کر دیکھا تو امانت چوری ہوچکی تھی۔ حالانکہ از روئے شرع آپ پر رقم ذمہ نہیں تھی۔ لیکن حج سے واپس آئے تو آپ نے اپنا مکان جس میں آپ کے بیوی بچے رہتے تھے خواجہ شبیہ الحسن یعنی بھائی چھوٹے کے ہاتھ فروخت کردیا۔ کیوں اس زمانہ میں چار ہزار کی رقم بہت بڑی تھی۔ آپ کا مکان معمولی مکان نہیں تھا۔ بڑی حویلی تھی۔ آج تو کروڑوں میں بھی نہیں مل سکتا۔ آپ نے چار ہزار روپے میں فروخت کرکے ان صاحب کو رقم دیدی جن کی رقم آپ کے صندوق سے چوری ہوگئی تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں بہت سے لوگ پاکستان کی طرف کوچ کررہے تھے۔ اور ایک ماحول بنا ہوا تھا۔ آپ کی اہلیہ محترمہ شوکت جہاں صاحبہ نے بھی کہا کہ ہم پاکستان کے شہر کراچی چلے جاتے ہیں وہاں اچھا رہے گا۔ آپ نے بادلِ نخواستہ اجازت دیدی۔ اور خود خانقاہ میں مقیم رہے کیوں کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ نے فرمایا تھا کامل صاحب آپ خانقاہ کو آباد رکھیئے۔ اس لئے اس وقت آپ نے ہجرت نہیں کی۔

آپ ہر آدمی سے ملاقات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اگر کوئی خصوصیت سے آپ سے ہی ملاقات کے لئے سفر کرکے آتا تو اسکو ملنے کا موقع عنایت فرماتے۔ اور اس کے اخلاص کو بھی ملاحظہ فرماتے۔ روزانہ ڈاک آتی خطوط ملاحظہ فرماتے اور جواب لکھتے۔ اکثر و بیشتر خطوط لکھنے کی ذمہ داری بندہ کے سپرد ہوتی۔ اوراد و وظائف کے متعلق خطوط ہوتے تو ان کے اسباق کو آگے بڑھانے کی ہدایت فرماتے۔ الحمدللہ مریدین اور متوسلین کے حالات قابل رشک ہوا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو

بھٹکے ہوئے لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کا شرف بخشا۔ آپ خوب خوب رہنمائی فرماتے یہ صفحات اجازت نہیں دیتے کہ اتنے طویل مضمون کو میں یہاں نقل کرسکوں۔ بڑے بڑے پاپ سنگرس اور موسیقی نواز لوگوں کی ہدایت کا آپ ذریعہ بنے۔ خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ کی مسجد میں جو حضرت گنگوہیؒ کی مسجد کہلاتی ہے۔ جس مصلہ پر حضرت تھانوی۔ حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا یعقوب صاحب دیوبندی حضرت شیخ الاسلامؒ جیسی اجلہ شخصیات نے نماز پڑھائی۔ اس مصلّہ پر آپ امامت فرماتے تھے۔ آپ کے عجیب وغریب حالات تھے کبھی کبھی دو دو تین تین دن کبھی چار چار دن اپنے ہجرے سے باہر نہیں آتے کھانا پینا۔ ملنا جلنا، بول و براز سے قطعاً اجتناب کرتے۔ اس دوران بندہ کے ذمہ تھا کہ امامت کے فرائض میں انجام دوں کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ ہندوستان کی معروف شخصیات یعنی اکابر علماء آتے اور اجان اندر رہتے۔ تو مجھے حکم فرماتے ادریس جاؤ نماز پڑھاؤ۔ میں عذر بھی کرتا کہ فلاں صاحب آئے ہیں وہی نماز پڑھادیں گے۔ تو فرماتے نہیں نہیں۔ میں نے کہا ہے تو جاکر نماز پڑھا۔ میں نماز پڑھا دیا کرتا تھا۔ اس لئے کم وبیش سات سال تک اکابر کے اس مصلہ پر بندہ کو امامت کا شرف حاصل ہے یہ صرف تحدیث نعمت کے طور پر لکھدیا ہوں۔

شاہ جی درویشؒ کے مزار کے سامنے کونے میں ایک حجرہ ہے اس میں شیخ الاسلامؒ کا قیام رہا ہے کہتے ہیں کہ شیخ الاسلام کے ذکر اللہ کی ضربوں سے اسکی دیوار میں شگاف آگیا تھا جو آج بھی ایسے ہی ہے۔ بندہ کو بحمداللہ تعالیٰ اس حجرے میں دو یا ڈھائی سال تک رہنے کا شرف حاصل ہے۔

شیخ ابوسعیدؒ نبیرہ شیخ عبدالقدوس قطب عالم کا بھی خانقاہ قدوسیہ رشیدیہ میں مسجد کے بائیں طرف برآمدے کے برابر میں ایک حجرہ ہے جس کا دروازہ چھوٹا ہے جھک کر اندر جانا پڑتا ہے۔ راقم الحروف کو اس حجرے میں بھی کافی دنوں تک قیام

کرنے کا موقع ملا تھا۔ یہی وہ حجرہ ہے جس میں شاہ ابوسعیدؒ رہتے تھے۔ کہ آپ کو اپنڈکس ہوگیا۔ اور مسلسل آپ پیٹ کے درد میں مبتلا رہنے لگے۔ تو ایک رات خواب میں حضور ﷺ تشریف لائے اور آپ کے پیٹ کا آپریشن اپنے دستِ مبارک سے فرمایا اور فاضل آنت کو کاٹ کر سی دیا۔ پھر اپنا مبارک لعاب دہن لگا دیا۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا کہ سوئی دھاگہ پاس رکھا ہوا ہے۔ اور پیٹ پر آپریشن کا نشان ہے (یہ شاہ ابوسعیدؒ کی بارگاہِ خداوندی میں قبولیت کی دلیل ہے) آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے دفن کرتے وقت یہ سوئی دھاگہ میری قبر میں رکھ دینا۔ چنانچہ آپ کو دفن کرتے وقت ساتھ رکھ دیا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہ، رحمۃ واسعہ

گفتگو تو اجان کے متعلق چل رہی تھی درمیان میں کچھ باتیں بھی آ گئیں۔ حضرت گنگوہیؒ کا قول ہے جو اس خانقاہ میں ویسے ہی پڑا رہا وہ بھی محروم نہیں رہتا۔ بڑی برکت والی جگہ ہے۔ ہمارے اکثر اکابر اور مشائخ کی اس خانقاہ میں تربیت ہوئی۔

اجان کو عمر کے آخری حصہ میں خوب عروج عطا ہوا۔ ترکی کے ایک شیخ جن کے تین لاکھ مریدین ترکی میں تھے وہ اجان کو ترکی لے کر گئے۔ اور اپنے مریدین کو اور خود بھی اجان کے ہاتھ پر بیعت ہوگئے۔ اس طرح عمر کے آخری حصہ میں اجان کے کئی لاکھ مریدین ہوگئے۔ کراچی کلفٹن کے علاقہ میں آپ رہتے تھے ایک بیوہ عورت جو اجان کی مرید تھی اس نے ایک گھر اپنے مرحوم شوہر کے ایصال ثواب کے لئے اجان کو دیدیا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ عورت اندھیری بمبئی کی رہنے والی تھی۔ اس نے گھر کی چابی لاکر دی۔ جب اس مکان کو کھول کر دیکھا تو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ کئی لاکھ روپے کا کراکری کا سامان تھا۔ کئی تھیلے چاندی کے زیورات اور ایک تھیلہ سونے کے زیورات کا اس میں موجود تھا۔ اس کی صفائی کرتے وقت کافی دولت اجان

صاحب کے ہاتھ آئی جو آپ نے اپنے صاحبزدگان کو دیدی۔ اس کے بعد آپ پر مزید فتوحات کے دروازے کھلے۔ پاکستان کے صدر نواز شریف بھی آپ سے بیعت ہوگئے۔ اور دیگر بڑی شخصیات بھی آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئیں۔

الحاج سید سلیم اطہر صاحب شاہ صاحب جو حضرت ہارون چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسہ ہیں۔ شاہ صاحب حضرت ہارون چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی دختری اولاد میں ہیں اور حضرت ہارون چشتی رحمۃ اللہ علیہ صاحب سید سلیم اطہر صاحب شاہ صاحب کے جدامجد ہیں۔ حضرت سید محمد اسحاق صاحب چشتی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولایت صاحب رحمۃ اللہ علیہ مخدوم جی کے نام سے مشہور ہیں۔ جو کہ حضرت شاہ ہارون چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے داماد ہیں اس لئے سید سلیم اطہر صاحب، حضرت شاہ ولایت صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی پسری اولاد میں ہیں۔ اس لئے سید سلیم اطہر صاحب کا صحیح اسم گرامی مخدوم زادہ الحاج سید سلیم اطہر صاحب ہے۔ سہارنپوری نے مجھے بتایا کہ میں جب پاکستان اجان سے ملنے کے لئے گیا۔ تو اس وقت آپ اس محل میں مقیم تھے جسکو ایک پاکستان بھائی نے کسی عرب شیخ سے خرید کر اجان کو تحفے میں دیا تھا کہ آپ اس کو اپنی خانقاہ بنالیں۔ کہتے ہیں کہ شیخ نے بھی آدھی قیمت میں فروخت کردیا تھا۔ پندرہ یا سولہ سال قبل اس محل کی آدھی قیمت ۲۰ کروڑ روپے تھی۔ بہرحال زندگی کا آخری دور بھی اجان کا بڑا شاہانہ دور رہا۔ یہاں اہل گنگوہ نے تو انکی پذیرائی نہیں کی۔ لیکن پاکستان جا کر فتوحات کے دروازے کھل گئے۔

مگر افسوس کہ ہندوستان کے اکثر مریدین کا حضرت سے رابطہ نہ رہا۔ طریقت کے اس شہ سوار کا وقت آخیر آ گیا اور ۱۱/اپریل ۲۰۰۳ء کو خانوادۂ گنگوہیؒ کا یہ آفتاب چند مہتاب اپنی روشنی بکھیرتے ہوئے ابدی نیند سوگیا۔ آپ کی قبر اسی محل میں بنائی گئی ہے۔ پاکستان کے حالات ابتر ہیں۔ راستے مخدوش ہیں ویزے کی سہولیات نہیں ہیں۔ اس لئے پاکستان کا سفر مشکل ہے مجھے جیسے ہی وفات کی خبر ملی تو

ماہنامہ نقوش عالم میں آپ کے انتقال کی خبر شائع کی گئی۔ اور دارالعلوم محمدیہ میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ آپ کے اقوال اور آپ کی تقاریر کے کافی حصے راقم الحروف کے پاس موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آپ کی سوانح عمری کے ساتھ آپ کی تقاریر بھی شائع کی جائیگی۔ فی الحال یہ اجمالی خاکہ اجان کی زندگی کا میں نے جلدی میں بحکم حضرت مولانا مفتی محمد خالد سیف اللہ صاحب قاسمی عمت فیوضہم ناظم اعلیٰ جامعہ اشرف العلوم رشیدی گنگوہ خلف الرشید، استاذی حضرت مولانا قاری شریف احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ تحریر کردیا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت اجان صاحبؒ کی قبر کو نور سے منور فرمائے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

وَصَلَّ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ . وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

☆☆☆

حضرت حاذق الامتؒ عارف باللہ[۱۴]

حضرت مولانا حکیم زکی الدین احمد صاحبؒ

مصلح زماں، طبیب دوراں، عارف باللہ، آفتاب علم نبوت، حاذق الامت حضرت مولانا الشاہ حکیم زکی الدین احمد صاحب قبلہ رحمہم اللہ خلیفہ ومجاز حضرت مسیح الامتؒ جلال آبادی، پرنامبٹ تمل ناڈان پاکیزہ نفوس میں سے تھے کہ جن کو اللہ رب العزت نے اپنے زمانہ کے لوگوں کی اصلاح وتربیت کے لئے مخصوص فرمایا ہے۔ حضرت والا کی عادتِ شریفہ تھی کہ جو بات ارشاد فرماتے پہلے اس کو خوب اچھی طرح سوچ لیتے اور پھر اس کو اس طرح سے سمجھا دیتے کہ حاضرین میں سے کسی کو تشنگی نہ رہتی، آہستہ آہستہ نرمی کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رہتا، چہرہ پر مسکراہٹ سجی رہتی، ہر آنے والا یہ محسوس کرتا کہ حضرت کی توجہ میری طرف زیادہ ہے، حسبِ مراتب اعزاز، حسب صلاحیت کلام فرماتے، بے جا گفتگو کی قطعاً عادت نہ تھی، جملہ معاملات میں میانہ روی کو پسند فرماتے، جوش وجذبہ میں نہ بات کہنے کا مزاج رکھتے تھے اور نہ ہی بات سننا پسند فرماتے، ایسے موقعوں پر بارہا آپ کی زبان سے نکلتا، ''نہیں نہیں ذرا

[۱۴] ماخوذ: از سوانح حاذق الامت، مرتب محمد ادریس حیان رحیمی، مطبوعہ ادارہ اشاعت اسلام دیوبند

سوچو سمجھو جوش اچھی چیز نہیں ہے، متانت اور سنجیدہ گفتگو کام آتی ہے اور اس کا نتیجہ نکلتا ہے۔ فی زمانہ عمل سے زیادہ لوگ علم کو اہمیت دے رہے ہیں، اور عمل ہو یا نہ ہو مسلک پر اڑے رہتے ہیں، ایسے موقعوں پر حضرت والاؒ ادرشاد فرماتے، ''آج بین المسلمین اتفاق واتحاد ہر حال میں لازمی ہے'' اور مسلک کے بارے میں ارشاد فرماتے ''اپنا مسلک چھوڑو مت، دوسرے کا مسلک چھیڑو مت''۔

علم وحکمت کے دریا بہا دیئے

مجلس میں شریک ہونے والے ہر شخص پر گہری نظر رکھتے، اسکے آنے کا مقصد، نیت، اخلاص اور ظاہری وباطنی حالات کو اچھی طرح سے سمجھ لیتے اور حسب حال اصلاح کا طریقہ اپناتے مجمع اور بھیڑ جمع کرنے آتا وعظ فرماتے، کبھی بنگلور دار العلوم محمدیہ تشریف لاتے، مزاج میں آتا وعظ فرماتے، ورنہ اکثر ارشاد فرماتے مولانا حبان صاحب! میں وعظ وتقریر اور اسٹیج کا آدمی نہیں ہوں، یہ حضرت والا کی کسر نفسی تھی حالانکہ جب کبھی اسٹیج پر بولنے کا وقت آتا تو بڑے بڑے مقرر اور خطباء کے سامنے ایسے نکات ارشاد فرماتے کہ اہل علم حیران رہ جاتے۔ میرے شیخ کا مزاج مبارک یہ ضرور تھا کہ عوام سے زیادہ اہل علم اور صاحب الرائے حضرات سے مخاطبت فرماتے اور شوق سے گفتگو فرماتے، اسرار ورموز سے پردہ اٹھاتے، علماء کے سامنے محققانہ کلام فرماتے، مثلاً ایک بار ارشاد فرمایا ''بتائے کہ پانی پینے کی دعا کیا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے کہ عوام الناس میں سے کوئی بھی کرسکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا اور بھول گئے کبھی خیال بھی نہ آیا، پھر آپ نے برجستہ دعا پڑھ کر سنائی **"الحمد لله الذی سقاناً مائًا عذباً فراتاً ولم یسقنا ملحاً اُجاجاً"** سبحان اللہ سنتوں پر حضرت والا کا عمل کیسا تھا۔ ہم آج تک الحمد للہ کو ہی پانی پینے کی دعا سمجھتے رہے، مجلس

میں ایک بار سائل نے عرض کیا، حضرت خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے یہ حدیث شریف میں ہے لیکن یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ چھیالیسویں حصہ کا مطلب کیا ہے، حضرت نے برجستہ درج ذیل جواب عطا فرمایا اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ نبوت کے چھیالیسویں حصہ سے کیا مراد ہے اور ارشاد فرمایا، نبوت کا زمانہ ۲۳ سال ہے اس کے ۴۶ حصے کرو تو ایک حصہ ٦ ماہ کا ہوتا ہے، جیسے روپئے کا دسواں حصہ دس پیسے ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حساب بھی لگایا جاسکتا ہے، تفصیل ملاحظہ فرمایئے!

خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ

خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، ۲۳ سال زمانۂ نبوت، چھیالیسواں حصہ ٦ ماہ ہوتے ہیں، ۴٦/ ١۔٦ ماہ ہوتے ہیں اس حساب سے کہ زمانہ وحی ۲۳ سال، زمانۂ نبوت کا چھیالیسواں حصہ کیا اور کیسے اور کتنا ہوا، تو چھ ماہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوا اور اول چھ ماہ مبشرات صادقہ ہیں، اکابر علماء آپ کے پاس مشکل سے مشکل سوالات اور اشکالات لے کر آتے تو ہنستے مسکراتے برجستہ ان کا حل فرما دیتے، اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو عجیب غریب صفات سے نوازا تھا، یہی وجہ ہے کہ بلا لحاظ مسلک علماء، دانشوران، عوام وخواص حضرت حاذق الامتؒ کی مجلس میں شریک رہتے تھے، غیر مسلم بھی حضرت والا سے دعا، دوا، غرض اپنی تکالیف، حاجات کے متعلق درخواست کرتے رہتے تھے، آپ نے کبھی بھی کسی کو مایوس نہیں فرمایا۔

یہ بات ظاہر کرنے کی نہیں ہے لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حضرت والا کے مریدین متعلقین میں سے کوئی بیمار ہو جاتا یا گھریلو پریشانیوں اور حالات کے تحت تنگی آجاتی تو حضرت والاؒ خاموشی کے ساتھ مالی اعانت بھی فرماتے، اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی، بتایئے ایسا پیر آج کہاں ملے گا، جو اپنی حلال، پاک اور محنت

کی کمائی سے اپنے متعلقین کی مدد کرے۔ آپ ایک خشک اور روایتی شیخ نہیں تھے بلکہ زندگی کی حقیقت سے قریب کرنے کے لئے قرآن وسنت کو معیار قرار دیتے تھے اور صحابہؓ، تابعین، اولیاء، علماء، صلحاء کے نقش قدم پر چلنا ضروری تصور فرماتے سالکین کو سہل اور آسان راستہ تلقین فرماتے، تزکیۂ نفس، ریاضت دنیا سے بے رغبتی کے لئے نفس اور جان پر جبر اور سختی کو ناپسند فرماتے۔ ارشاد فرماتے کہ خوب کھاؤ اور خوب محنت کرو، حلال اور پاکیزہ کھانے سے پرہیز کیا معنیٰ؟ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے جو بھی سہولت اور آسانی سے دستیاب ہو سکے، رغبت اور چاہت سے کھاؤ، البتہ حرام اور شکوک وشبہات والی اشیاء سے بچو۔ ریاکاری سے نفرت کا اظہار فرماتے، تکبر، غرور اور نفس کو فربہ کرنے والے اعمال بد سے ڈراتے، نفس کو مٹانے اور خواہشات کو کم کرنے کی نصیحت فرماتے، راقم الحروف خادم نے ایک بار اپنی آنکھوں سے دیکھا تو حیران رہ گیا کہ حضرت والاؒ اپنے دست مبارک سے آنے والے مہمانوں کے جوتے سیدھے کر رہے تھے، اللہ اللہ کیا بے نفسی تھی میرے شیخ میں کہ اپنے آپ کو بالکل مٹا دیا تھا، خودسری، خودغرضی کے بجائے خودفراموشی کی کیفیت رہتی تھی۔

کچھ یادیں کچھ باتیں

گزشتہ کئی برسوں میں علوم اسلامیہ کے سپوت اور بحر معرفت کی کئی قدآور شخصیتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئیں، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، حضرت مولانا منظور احمد صاحب نعمانی اور قاری صدیق احمد باندوی رحمہم اللہ جیسے اساطین علم ومعرفت ہمارے درمیان سے دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، ان ہی حضرات میں ہمارے شیخ، عارف باللہ حاذق الامت حضرت مولانا حکیم ذکی الدین احمد رحمۃ اللہ علیہ (پرنامبٹ) کی ذات گرامی

مغتنمات میں تھی۔ افسوس صد افسوس کہ ہمارے حضرت نے ۲۲؍دسمبر ۲۰۰۲ء کو دن کے دس بجے صوبہ تمل ناڈو کے ایک مردم خیز قصبہ پرنامبٹ میں باوضو، نماز اور سجدہ کی حالت میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ملاء اعلیٰ سے جا ملے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

حضرت مسیح الامت حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں سے ہیں اور حضرت حاذق الامت حضرت مسیح الامت کے خلفاء میں سے ہیں، لیکن حاذق الامت کو ان میں خصوصی مقام ومرتبہ حاصل ہے، حضرت والا پرنامبٹ ضلع شمالی آرکاٹ تمل ناڈو کے ایک علمی خانوادہ کے درخشاں ستارہ ہیں، آپ کا خاندان ہمیشہ صاحب الورع والتقویٰ اور ماہتاب منازل ولایت اور وسیلۂ سعادت حضرات سے پر رہا ہے، حضرت والا جہاں جسمانی امراض کے معالج تھے وہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو روحانی معالج کے اعتبار سے بھی دردمند دل عطا فرمایا تھا، آپ امت کی اصلاح کیلئے ہر وقت بے چین اور خدمت دین کیلئے اپنے آپ کو مٹاتے رہتے تھے، اکابرین سے جو فیوض اور نسخۂ کیمیاء حاصل کیا تھا اس کی خوشبو سے امت کا ایک بڑا طبقہ معطر ہو رہا تھا۔ آپ حاذق الامت بھی تھے، جید عالم دین، بہترین حکیم اور نباض بھی تھے، آپ وعظ ونصیحت کرتے اور بسا اوقات مریدین ومتوسلین کی اصلاح بھی فرماتے، ہر ملنے والوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے اور ملنے جلنے والوں کے مشکل معاملات کا حل بھی نکالتے، آپ سینکڑوں مدارس ومکاتب کے سرپرست بھی تھے، بڑے بڑے علماء، ائمہ اور عمائدین قوم وملت آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں، آپکے خلفاء میں جہاں کبار علماء کا نام ہے وہیں حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم محمد ادریس حبان رحیمی مدیر دارالعلوم محمدیہ کا نام نامی اسم گرامی بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے، آپؒ مولانا رحیمی سے بہت زیادہ محبت فرماتے اور ہمیشہ ملنے کا اشتیاق ظاہر فرماتے، ہمہ وقت شرعی لباس زیب تن فرماتے، کبھی گول ٹوپی تو کبھی پانچ کلی کی ٹوپی اوڑھتے، آپ ہمیشہ کلی والا کرتہ گھٹنوں سے نیچا

استعمال کرتے اور کلی والی شرعی بھی استعمال کرتے، ہمیشہ شیروانی زیب تن ہوتی، سفر میں ہوں یا حضر میں ہاتھ میں عصاء ضرور ہوتا، پیر میں ہمیشہ جوتا ہوتا۔ خوب بھوک لگنے پر کھانا تناول کرتے، پانی بالکل ٹھنڈا اور چائے خوب میٹھی نوش فرماتے۔

ہمارے حضرت ہمیشہ صاف اور سفید کپڑے پسند فرماتے، مریض کیلئے سستے اور بہترین نسخوں کا انتخاب فرماتے، راقم الحروف کی پہلی مرتبہ ۲۰۰۲ء میں آستانہ پر حاضری ہوئی تھی، راقم الحروف کی خواہش تھی کہ حضرت سے بیعت ہو جائے اس کا تذکرہ حضرت مولانا محمد ادریس حبان رحیمی سے کیا حضرت عدیم الفرصتی کے باوجود فوراً ساتھ لیجانے کیلئے تیار ہو گئے، رفقائے سفر میں حضرت مہتمم صاحب کے علاوہ محترم افضل پاشاہ، محترم عبدالرحمٰن بابو بھائی صاحبان ساتھ تھے، چند افراد پر مشتمل یہ قافلہ حضرت کے دولت خانہ پر ظہر کی نماز کے وقت پہنچا، چونکہ آمد کی اطلاع قبل از وقت ہی دیدی گئی تھی اس لئے حضرت شیخ قافلہ کے انتظار میں اپنی پلکیں بچھائے ہوئے تھے جب یہ قافلہ حضرت شیخ کے دولت خانہ پر پہنچا تو حضرت سے ملاقات ومصافحہ اور معانقہ کے بعد چائے نوشی کا دور چلا اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کی گئی، بعد ازاں پر تکلف اور مختلف انواع واقسام کے کھانے دستر خوان پر چنے گئے کھانے سے فارغ ہو کر حضرت قیلولہ کے لئے اندر تشریف لے گئے اور عصر سے قبل ہی حضرت نے حاضرین کو قیمتی نصائح سے نوازا، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ درس حدیث ہو رہا ہے، درمیان میں سوال وجواب کا سلسلہ جاری تھا حضرت والا ہر سوال کا تشفی بخش جواب دے رہے تھے، پھر عصر کی نماز کے بعد حضرت شیخ مصلیٰ پر ہی بیٹھے رہے اور راقم الحروف کو بھی ساتھ بٹھالیا، باقی تمام کو خانقاہ میں جانے کی اجازت مرحمت فرمادی، اس وقت حضرت شیخ کے پاس راقم الحروف کے علاوہ کوئی اور نہ تھا، بیعت کے وقت حضرت نے جو قیمتی نصیحتیں فرمائیں وہ ابھی بھی قلب پر نقش ہیں، پھر بعد نماز مغرب

چائے نوشی کے بعد قافلہ کی واپسی ہوئی، حضرت مہتمم صاحب نے فرمایا کہ حضرت والا اتنی جلدی کسی کو بیعت نہیں کرتے ہیں معلوم نہیں تم کو اتنی جلدی اور آسانی سے کیسے بیعت کرلیا، اس کے بعد تو ملاقات کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا، راقم الحروف بارہا حضرت مہتمم صاحب کی معیت میں پرنامبٹ حاضر ہوتا اور حضرت والا بھی تشریف لاکر شرف زیارت بخشتے اور اپنے پند ونصائح سے نوازتے۔ ایک موقع پر حضرت والاؒ نے فرمایا تھا کہ استاذ کو استاذ کی طرح رہنا چاہئے، طلباء کو شفقت ومحبت سے پڑھانا چاہئے، اپنے غصہ کو طلباء پر نہیں اتارنا چاہئے، علم کے ساتھ اخلاق پر دھیان دینا چاہئے اور ہمیشہ اصلاح کی فکر ہونی چاہئے! کیوں کہ اصلاح بہت ضروری ہے۔

اب جبکہ حضرت والا نہیں رہے اس منفرد اور لازوال خوشبو کو بکھیرنے کی زمہ داری عالی پروقار حضرت مولانا محمد ادریس حبان رحیمی مہتمم دارالعلوم محمدیہ (خلیفہ ومجاز حضرت حاذق الامتؒ) کے کاندھوں پر آن پہنچی ہے۔

سنا ہے خاک سے لیکن نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی

دعا ہے کہ باری تعالیٰ حضرت والا کو قبر میں کروٹ کروٹ چین وسکون نصیب فرمائے اور ہمیں ان کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمام ورثاء، مریدین اور متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

حاذق الامت کا مختصر سوانحی خاکہ

ولادت باسعادت: ۱۳۵۸ھ بمطابق 1937۔ **ابتدائی تعلیم:** مدرسہ اشاعت الحسنات۔ **مولوی فاضل:** مدرسہ عربیہ دارالعلوم پرنامبٹ ۱۳۷۶ھ بمطابق ۱۹۵۷ میں تکمیل ہوئی۔

اساتذہ کرام: آپ کے والد بزرگوارؒ، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحبؒ، شیخ الحدیث مولانا مفتی نثار احمد صاحبؒ۔

رفقاء حضرات: مٹیکار حافظ مولوی عبدالرزاق صاحب، آمنہ مولوی حافظ عبد الرزاق صاحب مولانا محمد ایوب صاحب، چتانے مولوی خلیل الرحمان صاحب، حافظ مولوی عبدالنور صاحب امم بٹ، مولوی عبدالرشید صاحب ایم پیٹ۔

طب: کرنول طیبہ کالج۔ **خدمتِ خلق**: بحیثیت طبیب ۴۳ سال۔

تصوف: ۱۲ سال حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ سے زمانہ طالب علمی سے تعلق رہا اور استفادہ کیا۔ **بیعت شیخ**: بذریعہ خط وکتابت پھر ممبئی تشریف لانے پر براہ راست بیعت سے مشرف ہوئے۔

شیخ ثانی: شیخ کے وصال کے پندرہ سال بعد حضرت مولانا محمد مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی سے تعلق فرمایا۔

خلافت: صرف، ڈیڑھ سال میں منازل سلوک طے کر کے حضرت کے مجاز وخلیفہ ہوگئے۔ **خلفاء**: تیرہ ہیں۔ ان میں حضرت مولانا الحاج مفتی عبدالوہاب صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔

تدریسی خدمات: اعزازی طور پر اپنے مطب میں اکثر بعد نماز صبح درس دیا کرتے تھے جیسا کہ پچاس سالہ روئیداد میں حضرت مولانا محمد ایوب صاحب رقمطراز ہیں ''کہ دارالعلوم کے منتہی طلباء کو برابر درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھے طلباء مدرسہ لطیفیہ ویلور میں چند سال قبل اعزازی طور پر درس حدیث وغیرہ سے استفاضہ کئے ہیں۔ **رفاہِ عام**: سینکڑوں مدارس عربیہ اور اسکول سے تعلق۔ **دینی خدمات**: وصیۃ العلوم سے خاص تعلق: ہمارے کرم فرما حضرت مولانا الحاج حکیم محمد امین صاحب نوراللہ مرقدہ حضرت حاذق الامتؒ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر

ہم حضرت کا جو مدرسہ کے رکن رکین ہیں تذکرہ نہ کریں تو ناسپاسی ہوگی مدرسہ کی تعمیر و ترقی کے لئے ان کے دل میں جو تڑپ اور لگن ہے اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کو ان کے ساتھ مجالست کا اتفاق ہوا ہو باوجود مصروفیات کے مدرسے کے کاموں کے لئے وقت فارغ کرنا مدرسہ کے منافع کو اپنی ذاتی منافع پر ترجیح دینا ہمیشہ ان کا وطیرہ رہا ہے نیز اس مدرسہ کی ممتحن کی حیثیت سے ان کی خدمات ہمیشہ سے رہی ہیں مجلس وصیۃ الاسلام ان کی خدمات کی بے حد قدردان اور شکرگزار ہے۔

مدرسہ باب السلام سے آپ کا تعلق: ۱۸ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۴ فروری ۱۹۹۱ء بروز پیر مدرسہ کا پہلا جلسہ تھا جس میں حضرت مولانا حکیم زکی الدین احمد صاحبؒ، مولانا ابوالسعود صاحب اور مولانا محمد طلحہ صاحب اور مولانا محمد سلمان صاحب سہارنپوری وغیرہ تشریف لائے تھے اس میں دونوں مرحومین نے تشریف لاکر جلسہ کو رونق بخشی تھی اور ہماری عزت افزائی فرمائی تھی۔

وفات: ۲۷ شوال المکرم ۱۴۲۴ھ بمطابق ۲۲ دسمبر ۲۰۰۳ء بروز پیر دار فانی سے دار بقا کی طرف رحلت فرما گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

آہ! حاذق الامتؒ

ستم ظریفی تو کوئی دیکھے
ہنسانے والا رُلا کے اٹھا

بحمداللہ تعالیٰ دارالعلوم محمدیہ ۱۹۸۹ء میں قائم ہوا، اور اس پندرہ سالہ دور میں دارالعلوم محمدیہ کے اس خادم راقم الحروف اور جملہ اراکین نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اسلام کی یہ چھاؤنی، قرآن وسنت کی روشنی میں اکابر ومشائخ اور علماء حقانی کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کے تحت کام کرتی رہے۔ دارالعلوم محمدیہ کو یوم تاسیس سے ہی یہ

شرف حاصل رہا ہے کہ اکابر ومشائخ اور علماء حق کی ہمیشہ اس پر نظر التفات رہی۔ یہی وجہ ہے کہ بے سروسامانی اور مالی وسائل نہ ہونے کے باوجود اس ادارے نے قابل فخر تعلیمی اور ملی خدمات انجام دی ہیں۔ کارکنان، اساتذہ کرام نے اپنے اخلاص میں کبھی کمی نہ آنے دی۔ اور جیسے بھی ناگفتہ بہ حالات آئے کبھی شکوہ زبان پر نہ آیا اور بحمداللہ تعالیٰ کبھی مایوسی کو قریب نہیں آنے دیا۔ الحاج عبدالباسط صاحب (سابق صدر) مرحوم اور میرے محبّ دل نواز انور سادات مرحوم (سابق سکریٹری) بھی اس دینی وملی سفر میں میرے ساتھ چلتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں بلا لیا۔ اسکے بعد جناب سید افضل پاشاہ صاحب بے انتہا عقیدت ومحبت کیساتھ دارالعلوم کی قانونی سرپرستی فرما رہے ہیں اور اس ناکارہ خادم کیساتھ (دیگر اراکین کی طرح) قدم سے قدم ملا کر چل رہے ہیں اور ہمہ وقت ادارے کی فکر رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو دونوں جہان میں اس کا نعم البدل عطاء فرمائے۔ آمین!

ابتداء میں دارالعلوم محمدیہ کی یہ سرپرستی مفکر اسلام مبلغ دین حضرت مولانا سید عبدالقادر آزاد صاحب خطیب بادشاہی مسجد لاہور نے فرمائی۔ حضرت آزاد صاحبؒ فرمایا کرتے، بھائی مولانا حبان صاحب میں ہندوستان آپ کے مدرسہ کو نہیں جا سکتا ہوں، اس لئے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے کسی بزرگ کو سرپرست بنالو، تو حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے درخواست کی گئی، حضرت والا دارالعلوم کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ نیز دوسرے سرپرست حاذق الامت حضرت مولانا حکیم زکی الدین صاحبؒ قبلہ، خلیفہ ومجاز حضرت مسیح الامت نے ادارہ کی سرپرستی قبول فرمائی اور اپنے قدوم میمنت سے دارالعلوم کو زینت بخشی اور جب بھی ضرورت محسوس ہوئی رہنمائی اور مشورے کیلئے حضرت اقدسؒ کی خدمت میں پرنامبٹ حاضر ہو جاتا، خصوصاً الحاج سید افضل صاحب اور الحاج عبدالرحمٰن بابو بھائی ضرور میرے ساتھ ہوتے۔

حضرت حاذق الامتؒ دارالعلوم محمدیہ تشریف لاتے تو اساتذہ کرام سے، طلباء سے، جامع مسجد دارالعلوم کے مصلیان کرام سے اور علاقہ کے مسلمانوں سے ملاقات فرماتے، اور خرابی یا خامی کی نشان دہی فرماتے، کبھی طلباء کے لباس پر اور کبھی ان کے بالوں پر، کبھی ان کی گفتگو کے الفاظ پر تنبیہ فرماتے۔ طلباء کے معیار کے مطابق علمی گفتگو فرماتے، اساتذہ کرام کو شفقت اور مہربانی کی تعلیم فرماتے۔ طلباء کو مارنے پیٹنے سے سخت منع فرماتے، عوام الناس کو حرام سے بچنے اور حلال اختیار کرنے کی نصیحت فرماتے، تصنع اور تکلف سے بیزار رہتے، خشوع وخضوع کے طالب رہتے، اخلاص کی ترغیب فرماتے، راقم الحروف (ادریس حبان) سے کئی بار ارشاد فرمایا: مولانا! آپ کے مدرسہ میں بحمداللہ تعالیٰ سب کچھ ہے یعنی تعلیم بھی ہے، اور تربیت بھی ہے، حکمت وتدبیر کے ساتھ کام کا مزاج بھی ہے، اساتذہ بھی مخلص ہیں لیکن عمارت نہیں ہے، آج کے دور میں عمارت کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ اس سے ادارے کی ظاہری عظمت معلوم ہوتی ہے، اس لئے کچھ کوشش کرو اور اللہ کا نام لیکر مسجد اور مدرسہ کی نئی عمارت بنانے کا افتتاح کرو! بحمد للہ تعالیٰ حضرت اقدسؒ کے حکم اور خواہش پر ناکارہ نے ساؤتھ افریقہ کا طبی سفر کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرتیں ظاہر ہوئیں اور قدم قدم پر حضرت والا کی دعاؤں کا ثمرہ ملا، یہ ناکارہ خوش تھا کہ واپسی میں حضرت سے سفر کے پورے حالات عرض کروں گا نیز جلدی کام کو سمیٹنے کا ارادہ بھی تھا کہ ایک دن صبح (۲۲/ دسمبر ۲۰۰۳ء) بعد نماز فجر کے بعد یہ خادم آرام کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی، معلوم ہوا کہ بنگلور سے قاری عبدالباری حبانی بات کر رہے ہیں، انہوں نے روتے روتے یہ اندوہناک خبر سنائی کہ حضرت حاذق الامتؒ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" یہ سنتے ہی میرے دل ودماغ پر جیسے بجلی گر گئی، بے ساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، قاری عبدالرحمٰن صاحب جو میرے ساتھ تھے انہوں نے مجھے پکڑ

کر سیدھا کر کے لٹا دیا، لیکن کس کو چین آئے، اتنی دور کہ دو چار گھنٹہ میں پہونچنا ناممکن، حضرت والا کا مبارک چہرہ، گفتگو اور پرنامبٹ کی حاضری، اس ناکارہ کے ساتھ شفقت ومودت کا معاملہ سب یاد آنے لگے، ایک عکس کی طرح سب کچھ آنکھوں کے سامنے آگیا کیسے مشفق؟ کیسے مربی اور مہربان تھے؟

ایصال ثواب کے علاوہ (اتنے فاصلہ پر) کیا کرسکتا تھا؟ پرنامبٹ فون کیا تو ڈاکٹر ناصر الدین احمد صاحب اور ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب اور حضرت مولانا الطاف عزیز صاحب دامت برکاتہم خلیفہ ومجاز حضرت والاؒ سے فون پر بات ہوئی، ایک دوسرے کو دلاسا دیا، کیونکہ ایسے وقت میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن یہ اللہ تعالی کا نظام ہے کہ جب کام پورا ہو جاتا ہے تو بندے کو اس دنیا سے اٹھا لیا جاتا ہے، ہم جیسے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ ابھی سے کیسے انتقال ہو گیا، حالانکہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو اس کی زندگی کے آخری سانس تک تمام احوال وکوائف مادّی، روحانی، ظاہری، باطنی ریکارڈ ساتھ لاتا ہے، سب کچھ انسان کی نظر کے سامنے ہوتا ہے، بس ایک چیز چھپی ہوئی ہوتی ہے وہ ہے ''موت'' جب ظاہر ہوتی تو نفس فنا ہو جاتا ہے، اور یہ فنائیت حضرات انبیاء علیہم السلام سے لے کر اولیاء، قطب، ابدال صالحین اور ہر فرد وبشر کے حصے میں آتی ہے، حضرت قاری محمد طیب صاحب نے لکھا ہے کہ انسان کبھی مرتا نہیں بلکہ منتقل ہوتا ہے اور اس کی منزلیں بدلتی ہیں یہی ہمارے حضرت کے ساتھ ہوا کہ اللہ رب العزت نے حالت سجدہ میں حضرتؒ والا پر رحمت کی نظر ڈالی اور اپنے پاس بلا لیا، **رحمهم الله عليهم مغفرة واسعه**. میں بار بار سوچتا رہا کہ آخری وقت میں حضرتؒ کے دیدار سے محروم، نماز جنازہ میں شرکت سے محروم، لیکن ڈاکٹر ناصر الدین احمد صاحب فون پر بار بار یہی کہتے رہے کہ آپ اپنا کام پورا کر کے آئیں جلدی نہ کریں، انکے کلمات سے میں اپنے کام میں لگا رہا، فون پر

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ حضرت حاذق الامت بہت یاد فرما رہے تھے، حضرت کی یہ محبت وشفقت ہی میری دنیا وآخرت کا سرمایہ ہے حضرتؒ کے وصال پر مایوسی چھا گئی، بنگلور سے بار بار الحاج سید افضل صاحب، عزیزی قاری محمد حارث حبان سلمہ اور میری اہلیہ کا بار بار فون آتا رہا کہ اپنے آپ کو سنبھالو اور حضرتؒ اقدس ہی کے حکم سے آپ سفر پر ہیں، اللہ تعالیٰ کے نظام میں کون مخل ہوسکتا ہے، صبر کرو اور صبر ہی سب سے بہتر چیز ہے۔ یہ راقم الحروف بار بار سوچتا ہے کہ حضرت والا نے تو اپنے اعمال صالحات سے رتبہ رفع درجات کی صورت میں اللہ تعالیٰ سے حاصل کرلیا ہے، اس سلسلہ میں ہم کو فکر کرنی چاہئے کہ اب باقی زندگی قرآن وسنت کی روشنی میں حضرت والا کے نقش قدم پر گذاریں تاکہ ہم بھی اس شاہراہ پر چل کر حضرتِ اقدس اور دیگر پاک نفوس سے جاملیں، بہت آگے گئے، باقی ہیں جو تیار بیٹھے ہیں۔

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گذر گئے دل چاہتا ہے نقش قدم چومتا چلوں

اس سانحہ ارتحال پر کیا لکھوں، بس یہی کہوں گا کہ حضرت کی زندگی سے ہم خدّام کو رہنمائی ملتی ہے اور آپ کی موت سے یہ سبق مل رہا ہے کہ آخر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور اپنے مالک کے حضور حاضر ہونا ہے۔

تیری نیکیاں باقی تیری خوبیاں زندہ

شیخ کی زیارت کیلئے اچانک جلال آباد کی حاضری

اوہ حکیم صاحب ہیں!

خادم نے حضرت والا سے پوچھا کہ حضرت آپ جب شروع شروع میں جلال آباد گئے تھے چونکہ جب آپ کی اتنی بے تکلفی اور وہاں خانقاہ میں اتنی جان

پہچان نہیں ہوئی تھی اور وہاں کا ماحول بھی الگ ہے اور موقع بموقع آپ کا کبھی جانا ہوا ہوگا کوئی واقعہ یاد ہو تو سنائیے۔ آپ نے فرمایا کہ

ایک مرتبہ میں شروع شروع میں جلال آباد چلا گیا تو وہاں کے احباب سے میری شناخت تو نہیں تھی وہاں جو حضرات موجود تھے کہنے لگے کہ حضرت والا سے ان کی ملاقات نہیں ہوسکتی میں نے کہا کہ اچھا یہ ایک پرچی ان کی خدمت میں بھجوا دیجئے، راقم الحروف نے پوچھا کہ حضرت اس پرچی میں آپ نے کیا اطلاع کی تھی یا اجازت چاہی تھی یا کوئی اور بات لکھی تھی پرچہ لکھنے اور پڑھنے کا موقع ہوتا ہے، آپ نے اتنا بڑا پرچہ لکھ دیا۔ فرمایا ایک شعر لکھ دیا تھا۔

دیوانہ وار آہی گیا ان کی بزم میں
ایک رو سیاہ حسرتِ طاعت لئے ہوئے

حکیم زکی الدین احمد

بس حضرت والا یہ دیکھ کر باہر تشریف لائے، حاضرین کو تعجب ہوا کہ یہ کون شخص ہے جو حضرت والا خود ہی تشریف لا رہے ہیں حضرت والا نے وہ پرچی غور سے دیکھی اور فرمایا ''اوہ حکیم صاحب ہیں''! فرمایا دیکھو یہ حکیم صاحب ہیں جب دواخانہ میں یاد آئی اچکن پہنا اور چل دیئے''۔

فرمایا آپ نے ''کہ حضرت والا مہمان نوازی کا بہت اہتمام کرتے تھے جب کوئی تشریف لاتا تو آپ فرماتے آپ کب تک قیام کریں گے، حضرت دو دن قیام کروں گا، کہتے اچھا بہت خوشی کی بات ہے مہمان خانہ میں قیام کرو کسی نے کہا کہ حضرت شام تک قیام کروں گا اچھا تم کھانا کھا کر جاؤ کوئی مہمان کہتے کہ حضرت ابھی جانا ہے تو فرماتے کہ پانی تو پی لو کم از کم پانی پلا کر بھیجتے کسی کو بھی خالی نہ جانے دیتے، کوئی پیسے مانگتا تو پیسے دیتے، یہ حال تھا شفقت و محبت کا اور کرم کا۔

اپنے شیخ سے ملاقات کیلئے دور دراز کا سفر

حضرت والا اپنے شیخ سے تو محبت و احترام کا ایسا معاملہ کرتے تھے کہ واقعی آپ کے اس رویہ کو معمول بنانا یہ ایک کسی سالک کیلئے بے حد ضروری و لازمی ہے۔ حضرت والا پرنامبٹ سے جلال آباد کیلئے کبھی بھی اچانک پروگرام بنا لیتے تھے ایک مرتبہ راقم الحروف نے حضرت والا سے پوچھا کہ حضرت والا آپ جلال آباد پہنچنے کی کبھی پیشگی اطلاع دیتے ہیں یا اچانک ہی پہنچ جاتے ہیں تو جواب میں آپ نے فرمایا: ''میں نے کبھی اپنے جلال آباد پہنچنے کی اطلاع نہیں دی ہے، نہ ہی اپنا انتظار کرایا اس سے کیا فائدہ، فرمایا کہ حضرت مسیح الامتؒ کی حیات مبارکہ میں بھی بغیر اطلاع ایسے ہی پہنچ گیا''۔ درمیان میں باتوں باتوں میں حضرت والا سے عرض کیا گیا کہ حضرت آپ اچانک جب پہنچتے ہوں گے تو حضرت والا کتنے خوش ہوتے ہوں گے اور کیا منظر ہوتا ہوگا محبّ و محبوب کا۔

''فرمایا کہ ایک مرتبہ میں جلال آباد خدمت میں اچانک ایسے حاضر ہو گیا تو حضرت والا نے مجھے غور سے دیکھا کہ اتنی دور دراز سے بغیر اطلاع کئے کیسے آ گئے اور مطب وغیرہ، میں نے عرض کیا کہ حضرت والا کی یاد آئی اور میں چلا آیا'' راقم الحروف نے عرض کیا کہ حضرت! پھر حضرت والا کیا فرماتے تھے ان چیزوں کے دیکھنے کے بعد فرمایا کہ حضرت والا مجلس میں فرماتے تھے کہ دیکھو حکیم صاحب ہیں کتنی دور سے آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کی یاد آئی اور چلا آیا دیکھا حکیم صاحب کو فرمایا حضرت والا بڑی محبت سے مجلس میں تذکرہ فرماتے تھے کہ حکیم صاحب مطب میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ بڈھا یاد آ گیا اچکن منگوائی اور پہن کر چل کھڑے ہوئے۔ حضرت مسیح الامتؒ سے حاذق الامتؒ کا ملاقات کا سلسلہ بہت کم رہتا تھا کیونکہ آپ کا وطن ساؤتھ انڈیا

تھا اور نارتھ انڈیا میں حضرت مسیح الامتؒ کا قیام تھا تو ارادہ کر کے ہی جانا ہوتا تھا اتنی دوری اور ملاقات زیادہ نہ ہونے پر بھی حضرت مسیح الامتؒ کی شفقت اور توجہ کتنی تھی اس کا اندازہ آپ کو حضرت حاذق الامتؒ کے الفاظ میں ہی آپ ملاحظ فرمائیں! حضرت حاذق الامتؒ نے فرمایا:

''کہ میں حضرت مسیح الامتؒ کی خدمت میں جلال آباد پہنچا تین روز خانقاہ میں قیام کیا۔ تیسرے روز دہلی سے ٹکٹ تھا دہلی سے ریزرویشن کرالیا گیا تھا۔ حضرت اقدس نے دریافت کیا کہ حکیم صاحب کب تک قیام ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! آج شام کو دہلی سے ٹکٹ ہے۔ لہذا آج شام تک دہلی پہنچنا ہے، ابھی یہاں سے جانا پڑے گا۔ حضرت اقدسؒ نے فرمایا کہ جن کو ہم روکنا چاہتے ہیں وہ واپس ایسے ہی چل کھڑے ہوتے ہیں''۔

ویسے جا کر دیکھئے خانقاہ بھری پڑی ہوئی ہے۔ ہمارے حضرت حاذق الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے چہرے پر تاثرات چھپاتے ہوئے بس بیخود ہو جاتے تھے پھر آپ نے دل کی بات ظاہر ہی فرما دی حضرت حاذق الامت رحمۃ اللہ علیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مسیح الامتؒ کہ اس مبارک جملہ کا اتنا اثر ہوا کہ جلال آباد سے دہلی تک روتا ہوا آیا ہوں یہ اثرات تھے حضرت والا کے اندر۔ حضرت ہمارے لئے سراپا شفقت و رحمت بنے ہوئے تھے۔ فرمایا حضرت حاذق الامتؒ نے کہ متوسلین کے ساتھ اپنی اولاد سے بھی زیادہ شفقت کرنا ضروری ہے۔

☆☆☆

حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنیؒ [۱۵]

شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

عالم اسلام اور دنیائے انسانیت کی عظیم علمی و روحانی شخصیت حضرت مولانا زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت 11 رمضان المبارک 1315ھ، 2 فروری 1898ء میں قصبہ کاندھلہ ضلع مظفر نظر یوپی انڈیا میں ہوئی۔

ابتدائی دینی و مذہبی تعلیم اپنے والد محترم حضرت مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی اور چچا جان مولانا محمد الیاس کاندھلوی سے حاصل کی۔ 1329ھ/ 1911ء میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہو کر اپنی دینی و مذہبی تعلیم مکمل کر کے 1334ھ/ 1916ء میں سند فراغت پائی اور پھر اسی جامعہ مظاہر علوم میں یکم محرم الحرام 1335ھ/ 29 اکتوبر 1916ء میں استاذ بنائے گئے۔ اور چند سال بعد ہی آپ نے حدیث شریف کی بڑی کتابوں کا درس دینا شروع کر دیا۔

آپ کے پیر و مرشد حضرت مولانا خلیل احمد مہاجر مدنی اپنے زمانے کے بڑے عالم دین اور تحریک آزادئ ہند کے زبردست مجاہد اور قائدین میں تھے۔ تحریک خلاف میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں، تحریک آزادئ ہند کے سلسلہ میں

[۱۵] ماخوذ: از ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور، اگست ۲۰۱۲ء

چلنے والی زبردست تحریک ریشمی رومال کے سلسلہ میں جس طرح شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کو گرفتار کر کے مالٹا بھیجا گیا ایسے ہی آپ کو بھی بمبئی پہنچنے پر گرفتار کر کے نینی تال جیل بھیجا گیا تھا اور پھر آپ زندگی بھر حکومت انگریز کے غیر وفاداروں میں شامل رہے۔ چنانچہ آزادئ ہند کی تاریخ میں انگریز انٹلی جینس افسران کی رپورٹ میں لکھے گئے یہ الفاظ آج تک محفوظ اور موجود چلے آرہے ہیں کہ!

''محمود حسن اور خلیل الرحمٰن (صحیح خلیل احمد) کے بارے میں یو پی سی، آئی، ڈی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں کو غیر وفادار سمجھا جاتا ہے۔

(تحریک ریشمی رومال، ترتیب حضرت مولانا سید محمد میاں، ص:202)

یہ ہی وہ مولانا خلیل احمد ہیں جنہوں نے مولانا محمد زکریا کی علمی اور روحانی تربیت فرما کر ان کو عمدہ اخلاق، بہترین کردار اور اعلیٰ وروشن دماغ کی ایک سلجھی ہوئی شخصیت بنا کر خلاف اور اجازت عطا کی تاکہ مولانا زکریا موصوف اپنے پیرومرشد کے علمی وروحانی مشن اور مقصد کو آگے بڑھائیں اور پوری دنیا میں اس کو پھیلائیں۔

مولانا محمد زکریا موصوف نے اپنے پیرومرشد مولانا خلیل احمد موصوف کی خواہش کے مطابق علمی اور روحانی دونوں لائنوں سے پوری دنیا میں اعلیٰ اقدار پر مشتمل روشن خدمات انجام دیں اور پوری دنیا میں ہندوستان کا نام بلند کیا۔

چنانچہ علمی لائن سے آپ نے پچپن (55) سال تک جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں دینی ومذہبی تعلیم دے کر حدیث شریف کی کتاب سنن ابوداؤد شریف تیس (30) مرتبہ اور صحیح بخاری شریف اکتالیس (41) مرتبہ پڑھائی۔ اتنی طویل مدت تک حدیث شریف پڑھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں آپ کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد آسمان علم وفضل کے روشن ستارے بن کر دنیا سے جہل کی تاریکی دور نہ کر رہے ہوں اور دنیائے انسانیت کو علم وعمل اور فہم وبصیرت کی

روشنی تقسیم نہ کر رہے ہوں۔ آپ کا امتیازی وصف چونکہ خدمت حدیث شریف رہا ہے اس لئے آپ کے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تلامذہ بھی بطور خاص اسی مبارک واشرف فن کی اشاعت وخدمت میں مشغول ہیں۔

اگر ایک طرف آپ کے نامور تلامذہ نے ہندوستان میں دیوبند، سہارنپور، دہلی، کانپور، ہردوئی، الہٰ آباد، لکھنو، مرادآباد، جونپور، بمبئی، کلکتہ، گجرات، بہار، بنگال، آسام، کیرالہ، انڈومان اور مزید ملکی جغرافیائی سطح سے آگے بڑھ کر پاکستان، افغانستان، بنگلہ دیش، برما، نیپال، انگلینڈ، امریکہ، افریقہ، زمبیا، کناڈا میں قدیم درس نظامی کی بنیادوں پر قائم علمی اداروں میں عالمانہ آداب ووقار کے ساتھ علمی جھنڈا بلند کئے رکھا تو دوسری جانب کتنی ہی ملی تنظیموں وتحریکوں، عصری تعلیم گاہوں اور جدید افکار وخیالات رکھنے والے سرکاری وغیر سرکاری اداروں وجامعات، جیسے شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دینی وتعلیمی کونسل لکھنو، دارالمصنفین اعظم گڑھ، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، جمعیۃ علماء ہند، مجلس دعوت الحق ہردوئی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، محکمہ امور مذہبی ریاست حیدرآبار، مدرسہ عالیہ کلکتہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، شعبۂ تاریخ ادبی سندھی بورڈ حیدرآباد پاکستان، معہد الاسلامی کراچی پاکستان، اسلامک فاؤنڈیشن ڈھاکہ بنگلہ دیش، وائس آف اسلامک پبلشنگ کمپنی رنگون برما، ادارہ تہذیب الاسلام مانڈلے رنگون، برما، اسلامک ریلیجس آفیرس کونسل برما، مرکزی رویت ہلال کمیٹی برما، جمعیۃ علماء برما، دارالنشر العلمیہ جوہانس برگ افریقہ، ہیئۃ الدعوۃ والارشاد جامعہ ازہر قاہرہ مصر، لجنۃ التراث والتاریخ ابوظہبی امارت عربیہ متحدہ، المرکز الاسلامی ری یونین فرانس، رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرّمہ سعودی عرب جیسے وقیع اور باوزن اداروں، تنظیموں اور تحریکوں میں بھی آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے اور آپ سے علمی رشتہ استوار کرنے والے علماء وفضلاء دینی ومذہبی بیداری علم وحکمت کی

آبیاری اور قرآن وسنت کی ضیاء پاشی وجلوہ ریزی میں مصروف مشغول ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانان عالم کی دینی وملی رہنمائی اور سیاسی وفکری رہبری کا نازک اور اہم فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں جیسے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افریقہ، امریکہ، انگلینڈ، زمبیا، کناڈا میں آپ کے نام پر بڑے بڑے علمی ادارے اور جامعات قائم ہیں جن میں ہزاروں طلبہ دینی ومذہبی علوم حاصل کررہے ہیں۔

آپ کی عنداللہ وعندالناس مقبولیت ومحبوبیت بلندی اخلاق اور حسن اخلاص کی بناء پر تمام ہی مدارس کے ارباب اہتمام وانتظام آپ سے اپنے اپنے مسائل ومعاملات میں مسلسل رجوع کرتے رہتے، خصوصاً ہندوستان میں موجود جامعہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنو مدرسہ شاہی مرادآباد جیسے اداروں کے ذمہ دار ارکان وارباب انتظام آپ سے مسلسل رابطہ میں رہتے اور آپ سے اپنے معاملات ومسائل میں متواتر صلاح ومشورے لیتے اور آپ اپنی خداداد بصیرت کے مطابق ان کی پوری پوری رہنمائی اور راہبری فرماتے تھے۔

پروردگار عالم کی جانب سے آپ کو گہرے علم کے ساتھ ساتھ مضبوط اور پختہ قلم بھی دیا گیا تھا، چنانچہ آپ نے اپنے قلم کی طاقت سے دنیا بھر میں ایک صالح انقلاب برپا کردیا اور اپنے قارئین کو اسلامی ومذہبی ذوق وشعور کی پختگی مرحمت فرمائی۔

آپ نے اپنی زندگی میں ایک سوتین (103) کتابیں تصنیف کیں، جن میں لامع الدراری علی جامع البخاری، الکوکب الدری علی جامع الترمذی، جزء حجۃ الوداع والعمرات، اوجز المسالک شرح موطا امام مالک، الابواب والتراجم للبخاری، التقریر الرفیع لمشکاۃ المصابیح وغیرہ اپنی خداداد مقبولیت وقبولیت کی بناء پر عالمی وبین الاقوامی سطح پر پہنچ چکی ہیں۔ مذکورہ بالا تالیفات میں صرف ایک ہی تالیف اوجز المسالک

شرح موطا امام مالک کے درجنوں ایڈیشن ہندوستان وپاکستان، مصر، امارات عربیہ متحدہ، سعودی عرب اور لبنان سے وہاں کے جید علماء ومحدثین کی تحقیقات وتعلیقات کے بعد مسلسل شائع ہورہی ہے۔ بقیہ کتابوں کا اشاعتی وطباعتی ریکارڈ اس سے بھی کہیں فزوں تر ہے۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ.

سعودی عرب میں موجود آپ کے تلامذہ کی ایک جماعت حال ہی میں صحیح بخاری شریف پر آپ کی تمام علمی وفنی تحقیقات کو اٹھائیس (28) جلدوں میں مرتب کرکے الکنز المتواری فی معادن لامع الدراری وصحیح البخاری کے نام سے شائع کرچکی ہے۔ اور آج یہ کتاب عالم عرب کی بے حد مقبول اور پسندیدہ کتابوں میں شامل ہے۔

نامور علماء ومحدثین نے اس کتاب کو علم حدیث کی وقیع خدمت تسلیم کرکے اس پر اپنی تقریظات تحریر کیں، اور بہت سے علمی وتحقیقی مجلّات میں اس پر وقیع تبصرے شائع ہوئے۔ یہ وقیع اور عظیم علمی کام حضرت شیخؒ کے تلمیذ خاص وخلیفہ بااختصاص فضیلۃ الشیخ مولانا عبدالحفیظ حفظہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مکۃ المکرّمہ سعودی عرب کی نگرانی اور توجہ سے پایہ تکمیل کو پہونچا ہے۔ آپ کی تمام ایک سوتین (103) تالیفات اپنے فن اور موضوع کے اعتبار سے اس طرح بھی شمار کی جاسکتی ہیں۔

علم تفسیر پر 2 کتابیں، علم حدیث پر 60 کتابیں، علم فقہ اور اصول فقہ پر 4 کتابیں، علم تاریخ وسیرت پر 22 کتابیں، علم تجوید وقرأت پر 2 کتابیں، علم نحو منطق واقلیدس پر 3 کتابیں، علم سلوک واحسان پر 3 کتابیں، دفاع اسلام پر 4 کتابیں، متفرق مضامین پر 3 کتابیں، کل میزان 103 کتابیں۔ اس مجموعۂ تالیفات میں سے اب تک تقریباً (40) کتابیں شائع ہوپائی ہیں۔

ان مطبوعات کے آج دنیا کی اکتیس (31) زبانوں میں ترجمے منتقل ہوکر پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں، اسی طرح دنیا بھر کے انیس (19) ممالک کے دوسو

پندرہ (215) ادارے اور پریس آپ کی عربی واردو تصنیفات وتالیفات کی طباعت واشاعت میں مصروف ہیں۔

ان انیس (19) ممالک کے نام اور ان میں قائم یہ دوسو چھتیس (236) ادارے اس طرح ہیں:

(۱) انڈیا میں 19 ادارے، (۲) امارت عربیہ میں 2 ادارے، (۳) انڈونیشیا میں 2 ادارے، (۴) امریکہ میں 1 ادارے، (۵) ایران میں 4 ادارے، (۶) بنگلہ دیش میں 13 ادارے، (۷) انگلینڈ میں 5 ادارے، (۸) پاکستان میں 79 ادارے، (۹) برما میں 4 ادارے، (۱۰) تھائی لینڈ میں 1 ادارے، (۱۱) پرتگال میں 1 ادارے، (۱۲) سعودی عرب میں 3 ادارے، (۱۳) جنوبی افریقہ میں 7 ادارے، (۱۴) فرانس میں 3 ادارے، (۱۵) شام میں 2 ادارے، (۱۶) لبنان میں 5 ادارے، (۱۷) کینیا میں 1 ادارے، (۱۸) مصر میں 6 ادارے، (۱۹) ملیشیا میں 5 ادارے، کل (19) ممالک میں 236 ادارے۔

اسی طرح آج ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، تاجکستان، ازبکستان، انڈونیشیا، انگلینڈ، افریقہ، امریکہ، کناڈا، ترکی، جاپان، زمبیا، فرانس، سری لنکا، فیلپائن، کمبوڈیا، کینیا، ملیشیا، پرتگال، سعودی عرب، مصر، شام جیسے چھبیس (26) ممالک کے ایک سو پینتالیس (145) علماء اور دانشوران آپ کی تصنیفات وتالیفات کی علمی خدمت وتحقیق اور ان کو دیگر زبانوں میں تراجم کے ذریعہ منتقل کرنے پر لگے ہوئے ہیں۔ آپ کے دائرہ قلم کی وسعت وآفاقیت پر بطور شاہد عدل آپ کی خالص دعوتی واصلاحی کتاب ''فضائل اعمال'' ہے اور جو نو کتابوں فضائل قرآن، فضائل رمضان، فضائل تبلیغ، حکایات صحابہ، فضائل نماز، فضائل ذکر، فضائل حج، فضائل صدقات اور فضائل درود شریف کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی گہرائی اور

گیرائی کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان و پاکستان کے اسّی (80) سے زائد ادارے اور کتب خانے اس کے اردو ایڈیشن سالہا سال سے طبع کر رہے ہیں، اور اب اہل دانش وبینش کا تاثر یہ ہے کہ شیخ الحدیث مولانا زکریا کی یہ کتاب قرآن شریف کے بعد دنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی اور سنی جانے والی کتاب ہے، اور یقیناً دن ورات کے چوبیس گھنٹوں میں مشکل سے کوئی وقت ایسا گذرتا ہوگا جس میں دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں اس کتاب کا مطالعہ، مذاکرہ یا قرأت وسماعت نہ ہو رہی ہو۔

یہ کتاب اپنی تاثیر وافادیت، حلاوت، وجاذبیت، ونورانیت، وروحانیت، زبان وبیان کی لطافت وسلاست دلنشیں تعبیر وتفہیم اور سب سے بڑھ کر اپنی خداداد قبولیت ومقبولیت کی بناء پر آج اس طرح پر پہنچ گئی ہے کہ مشرق ومغرب شمال وجنوب میں یہ دینی محاذ کی ایک شناخت اور پہچان بن گئی ہے اور لاکھوں لاکھ بندگان خدا کی زندگیوں کو مادیت سے روحانیت اور بے دینی سے دین کی طرف لانے میں اس کتاب نے بڑا مضبوط اور گہرا کردار ادا کر کے دین ومذہب کی محبت وعقیدت دلوں میں اتار کر خالق ومخلوق اور عبد ومعبود کے درمیان رشتوں کو مضبوط ومستحکم کیا۔

☆☆☆

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ [16]

1999ء کے آخری روز عالم اسلام نے بڑے رنج وغم کے ساتھ شیخ علامہ سید ابوالحسن علی ندوی کو بیسویں صدی شروع ہونے سے چند گھنٹے قبل لکھنو (ہندوستان) میں الوداع کہہ دیا، وہ ندوہ کے ناظم اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی مجلس تاسیسی کے رکن تھے۔شیخ 1914ء میں ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو علم وحکمت میں مہارت رکھتا تھا،ان کے والد علامہ عبدالحی حسنی اپنی کتاب ''نزھة الخواطر'' کی وجہ سے مشہور ہیں جس میں انہوں نے ہندوستان کے مشہور اہل علم حضرات کے حالات قلم بند کئے ہیں۔شیخ ندوی کے بھائی ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ہیں جو اپنی روشن فکر اور ندوہ کی نمایاں نظامت کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔

شیخ ندوی دنیا کے بہت سے ملکوں میں گئے، وہاں لکچرز دیئے اور اسلام سے متعلق کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی اور اپنے سفر کے تجربات متعدد کتابوں میں قلم بند کئے۔مثلاً ''ترقی میں دو ہفتے'' اور ''مذاکرات سائح الشرق'' وغیرہ۔

شیخ عبدالعزیز بن باز آل الشیخ نے علامہ ندوی کے بارے میں ''الشرق الاوسط'' میں فرمایا: ''شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی کی وفات امت مسلمہ کے لئے بڑا

[16] مولانا محمد عبدالرشید ندوی روزنامہ راشٹریہ سہارا بنگلور، ۳۱ دسمبر ۲۰۱۰ء

خسارہ ہے ان کو ان کی پاکیزہ دعوت وتبلیغ اور ہندوستان میں ان کے دعوتی اثرات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے اور ان کی دعوت وتبلیغ بارآور بھی ہوئی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی وفات کو امت کا خسارہ سمجھا جاتا ہے۔شیخ کی بہت سی تالیفات ہیں جو ان کی اسلام کی خدمات سے دلچسپی پر دال ہیں، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔اور ان کے شاگردوں کو ہندوستان میں بہتر طریقہ پر دعوت وتبلیغ کی توفیق عطا فرمائے۔ڈاکٹر احمد التویجری نے کہا: شیخ کی زندگی دعوت الی اللہ، اسلام کا دفاع اور ہر جگہ خیر کی نشر واشاعت کے لئے جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ انہوں نے غیر اسلامی فکری طوفانوں کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور اسلام کے محاسن کو اجاگر کیا اور اس کو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کیا۔انہوں نے دنیا بھر کا سفر کیا تاکہ دلوں کو حرارت بخشیں اور لوگوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا کریں، وہ وحدت امت کی طرف بلانے والے داعیوں میں سب سے بڑے داعی تھے۔وحدت اسلامی کی دعوت اور الحاد کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں ان کے بڑے کارنامے ہیں جس کے گواہ شاہ فیصل مرحوم بھی ہیں۔ان کی تالیفات سے اگرچہ اسلامی لائبریری کی کئی الماریاں مزین ہیں جن کا شمار بہترین فکری اور تربیتی کتابوں میں ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک ان کی عملی سیرت اور اخلاقی کردار یہ دونوں وصف انتہا پر تھے اور یہی وہ میراث ہے جس کو وہ امت مسلمہ کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔

پروفیسر اسحاق احمد فرحان، رئیس زرقاء یونیورسٹی، رئیس حزب جبهة العمل الاسلامی اردن، نے فرمایا: وہ ہندستانی براعظم کے عالم اور عالم اسلام میں اس صدی کے نمایاں داعیوں اور مصلحین میں سے ایک تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور ان کو جنت الفردوس میں ان لوگوں کے ساتھ جگہ دے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے اور وہ نبیوں، صدیقوں، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں۔

رابطہ اسلامی کی بنیاد

پروفیسر فرحان نے مزید کہا: علامہ عربی النسل اور فصیح البیان تھے اگر چہ وہ پیدا ہندوستان میں ہوئے وہ "**مجمع اللغة العربية**" دمشق کے رکن، عربی زبان کے عاشق اور اس کے ماہر تھے کیونکہ عربی قرآن کریم کی زبان ہے، عربی زبانوں میں انہوں نے کتابیں لکھی، علمی مجلسوں میں اور عربی لوگوں میں مصر، شام، اردو، عراق اور سعودی عرب میں لکچرز دیئے۔ علامہ ندوی نے "رابطہ ادب اسلامی" کی بنیاد ڈالی کیونکہ ان کو امت اسلامیہ کی زندگی کے فکری وثقافتی میدان میں ادب اسلامی کے دور کی اہمیت کا ادراک تھا، انہوں نے خود دسیوں کتابیں اسلامی فکر، دعوت وتبلغ اور ثقافت پر تحریر کیں جن میں سب سے نمایاں کتاب "**ماذا خسر العالم بانحطاط امسلمين**" ہے جسے ہر داعی، ہر پڑھے لکھے اور دعوتی کام کرنے والے شخص نے پڑھا ہے۔ ڈاکٹر ذکی بدوی، ڈائریکٹر اسلامک کالج لندن نے شرق الاوسط کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: "ابوالحسن علی ندوی عظیم علماء میں سے ایک بڑے اور عالم اسلام کے لئے ہندوستان کا ایک تحفہ تھے، انہوں نے اپنی ساری زندگی معلم، مولف اور داعی الی اللہ کی حیثیت سے گزار دی، اپنے پیچھے ایک بڑا علمی سرمایہ 80 کتابوں کی شکل میں چھوڑ گئے جن کا ترجمہ متعدد زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ابوالحسن علی ندوی کا شمار ان چار بڑے علماء میں ہوتا ہے جنہوں نے ہندوستانی براعظم میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، پہلے عالم ابوالکلام آزاد ہیں جو مؤلف بھی ہیں مفکر بھی، رائٹر بھی ہیں اور سیاسی شخصیت بھی، انہوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے کانگریس پارٹی کے ساتھ تعاون کیا اور جواہر لعل نہرو انہیں "**وزارة التعليم**" کا سربراہ مقرر کیا۔ دوسرے عالم ابوالاعلی مودودی ہیں جنہوں نے ایک سیاسی اسلامی

تحریک "جماعت اسلامی" کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد حکومت کا حصول اور اس میں اسلامی شریعت کا نفاذ تھا۔ تیسرے عالم شیخ محمد الیاس تھے جنہوں نے تبلیغی جماعت قائم کی۔ جس نے امت کے افراد میں ایک دوسرے کے درمیان ربط وتعلق قائم کیا تا کہ وہ اخلاق وکردار میں شریعت کے پابند بنیں اور مادیت واباحیت نیز سیاست سے دور رہیں۔ چوتھے شیخ ابوالحسن علی ندوی ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم کے مخالف علماء

یہ چار علماء ہندوستان کی تقسیم کے مخالف اور اس بات کے قائل تھے کہ غیر منقسم ہندوستان ہی مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے، ان لوگوں کے اس اعتقاد کی سچائی اس وقت کھل کر سامنے آئی جب تقسیم ہندوستان کے وقت مسلمانوں کے قتل وغارت گری کا طوفان امنڈ آیا، جس کے اثرات آج بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ شیخ ابوالاعلی مودودی تو پاکستان ہجرت کر گئے البتہ باقی تینوں علماء ہندوستان ہی میں رہے۔ شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی نے اپنی پوری زندگی درس وتدریس میں لگادی، وہ ندوۃ العلماء کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، ندوہ ایک ایسا اسلامی ادارہ ہے جو "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی" کی جگہ لینے کے لئے قائم کیا گیا تھا جو سرسید احمد نے "محمڈن کالج" کے نام سے قائم کیا تھا تا کہ مغربی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کو یکجا کیا جاسکے لیکن ان کے دور کے علماء نے ان کی شدید مخالفت کی کیونکہ ان کی نظر میں یہ ادارہ مغربی علوم وثقافت کو اسلامی لیبل لگا کر پیش کرنے کی مہم میں سرگرم عمل تھا، اسی لئے علماء نے "ندوہ" قائم کیا تا کہ (وہاں کے فارغین اور متعلقین) دین کے ساتھ زیادہ مخلص رہ سکیں اور دین اسلام ہی تمام ادیان پر غالب رہے۔ شیخ ابوالحسن علی ندوی نے مذکورہ عظیم منصوبہ کی ترقی میں بڑا حصہ لیا اسی وجہ سے ان کو تمام علماء اسلام نے قدر واحترام اور پسندیدگی

کی نگاہ سے دیکھا، یہی نہیں بلکہ ان کو اسلامی اداروں نے لکچر دینے اور اپنے کاموں میں شرکت کرنے کیلئے بلایا۔ وہ ''رابطہ عالم اسلامی'' مکہ مکرمہ کے رکن تھے اور سعودی حکومت نے خانہ کعبہ کی کنجی ان کے علم وتقویٰ کی بنا پر ان کے سپرد کی تھی، مرحوم ایسے عالم کا نمونہ تھے جو اپنے معاصر علماء کے ساتھ بڑی تواضع وانکساری کے ساتھ پیش آتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں اور اپنے طلباء سے محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کسی اہل حکومت، صاحب وجاہت اور صاحب ثروت شخص کی قربت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، انہوں نے علماء سلف کے بارے میں لکھا اور بغیر کسی جانبداری کے ساتھ انصاف سے کام لیا۔ موجودہ معاشرہ کی کمزوریوں کے بارے میں لکھا تو علمی دلائل کیساتھ ان پر صحیح گرفت کی اور اپنے معاصرین کیساتھ خیر خواہی کا معاملہ برتا، ان کا یہ رویہ دین اسلام کو اس کے حقیقی معنوں میں بغیر کسی جانب داری کے سمجھنے کا نتیجہ تھا سوائے اس جانبداری کے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے''۔

شیخ ندوی کا حکومت کے خلاف احتجاج

ڈاکٹر ندوی نے مزید کہا: ''جب ہندوستانی حکومت نے مسلمانوں کے بعض عائلی قوانین ختم کرنے کی کوشش کی تو شیخ ندوی نے اس کی مخالفت میں احتجاجی تحریک کی سربراہی کی جس نے ہندوستانی حکومت کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا، اور جب ''اسلامک سینٹر، آکسفورڈ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے بانیوں نے اس کی نظامت مولانا کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ مسلمانوں میں اسے شرف قبولیت حاصل ہو سکے۔ میں جب آخری بار ہندوستان گیا تو میرے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا کیا تم ''علی میاں'' کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں! پھر میں نے کہا کہ لفظ ''علی میاں'' کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ہمارے علماء میں سے ایک عالم کا لقب

ہے۔ میں نے کہا میں نے ان کے بارے میں کبھی نہیں سنا تو انہوں نے کہا عجیب بات ہے، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم جیسا شخص ابوالحسن علی ندوی کو نہیں جانتا؟ میں نے کہا میں ابوالحسن علی ندوی کو تو جانتا ہوں، ان سے ملا بھی ہوں، ان کی تقریریں بھی سنی ہیں اور ان کی کتابیں بھی پڑھی ہیں لیکن میں علی میاں کو نہیں جانتا۔ اس نے جواباً کہا ہم ان کو علی میاں کہتے ہیں۔ اس طرح شیخ ندوی نے اپنے ملک ہندوستان میں تعظیم وتکریم کے اعتبار سے ایک الگ حیثیت منوا رکھی تھی''۔ ڈاکٹر صہیب حسن عبدالغفار، ڈائریکٹر ''مرکز التوحید'' مشرقی لندن نے کہا: ''شیخ ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو میں تعلیم حاصل کی جو ایک طرف اصلا مسلم نوجوانوں کو دینی علوم سے مسلح کرنے اور دوسری طرف عصری علوم سے بہرہ ور کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا۔ ندوہ نے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے درمیان معتدل راہ اختیار کی، کیونکہ دارالعلوم دیوبند نے اسلامی علوم کی تعلیم وتدریس کے ساتھ ایک متعین فقہی مسلک کی راہ اختیار کر رکھی تھی۔ جو اس زمانے میں وہاں رائج تھا جب کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انگریزی اور عصری علوم کی درس وتدریس کی امتیازی راہ اپنا رکھی تھی تاکہ نوجوانوں کی ایسی نسل تیار کر سکے جو اپنی علمی صلاحیت اور فکری ثقافت میں کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے فارغین سے کسی طرح کم نہ ہو۔ ندوہ ان دونوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اسی لئے اس نے ایک طرف تو اپنے نوجوانوں کو علوم شریعت سے مسلح کرنے کے ساتھ ان کے سامنے بحث تحقیق کی نئی راہیں کھولیں اور دوسری طرف عصری علوم سے بھی مسلح کیا اور اس طرح وہ قدیم کا رآمد اور جدید نافع علوم کا حامل بن گیا۔ شیخ ندوی نے عربی زبان تقی الدین ہلالی مرکشی سے حاصل کی جو ندوہ میں استاد تھے اور فکر وتحقیق میں سید سلیمان ندوی سے استفادہ کیا جو ہندو پاک کے بڑے محققین میں سے ایک ہیں۔ شیخ ابوالحسن علی ندوی کے مضامین ''سیرت سید احمد بن عرفان

الشہید'' کے عنوان سے قاہرہ کے رسالہ ''منار'' میں اس وقت شائع ہوئے جب کہ ان کی عمر صرف 17 سال تھی''۔

مولانا علی میاںؒ کا مقصد حیات

ڈاکٹر صہیب حسن عبدالغفار نے مزید کہا: ''ندوہ سے فراغت کے بعد ہی سے مزید علم حاصل کرنا اور تحقیق وتالیف کرنا شیخ ندوی کا مقصد حیات تھا، 1935ء میں تعلیم وتدریس میں مشغول ہوئے اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کو بھی اپنے مایہ ناز علمی وفکری تحقیقات سے اردو وعربی دونوں زبانوں میں نوازنے لگے، سیرت سید احمد بن عرفان الشہید ان کی جملہ تصانیف کا نقش اول تھا جس نے خود مصنف کی زندگی پر بھی اثر ڈالا، پھر انہوں نے اسلام کے متعدد مشاہیر علماء وصلحاء پر لکھا یہاں تک کہ یہ سلسلہ اردو میں ''تاریخ دعوت وعزیمت'' اور عربی میں ''**رجال الفکر والدعوۃ فی الاسلام**'' کی شکل میں مکمل ہوگیا، البتہ ان کی سب سے زیادہ مشہور کتاب جس نے دنیا بھر میں بڑی مقبولیت حاصل کی وہ ''**ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین**'' ہے جس کا دنیا کی چھ معروف زبانوں میں ترجمہ ہوا اور اس کو متعدد یونیورسٹیوں کے تعلیمی نصاب میں داخل کیا گیا۔ ان کے بارے میں کیمبرج یونیورسٹی کے مستشرق سارجنٹ نے کہا: ''اگر برطانیہ میں کتابوں پر پابندی لگانے کا قانون ہوتا تو میں اس کتاب کے برطانیہ میں داخلہ پر پابندی لگانے کی سفارش کرتا کیونکہ یہ کتاب مغربی تہذیب وتمدن پر بجلی کی طرح گرتی ہے'' اسی طرح لندن یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے چیئرمین ڈاکٹر بلنکھم نے کہا: 'یہ کتاب اس صدی میں حقیقتاً مسلمانوں کے عروج وترقی کے لئے ایک ایسا تاریخی اور مثالی وثیقہ ہے جسے بڑی علمی جدوجہد کے بعد تیار کیا گیا ہے''۔

شیخ ندوی کا قلم وہبی تھا

یہی نہیں بلکہ شیخ اپنے وہبی قلم سے ندوہ کے ترجمان ''البعث الاسلامی'' اور دیگر متعدد عالمی رسالوں میں مسلسل مضامین لکھتے رہے، مزید یہ کہ یکے بعد دیگرے کتابوں پر کتابیں تحریر کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ بحیثیت استاذ وناظم ندوۃ العلماء بھی آخری دن تک خدمات انجام دیتے رہے اور متعدد عالمی یونیورسٹیوں کے وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ ہندوستان میں جماعت اسلامی کی قیادت کے ابتدائی دور میں وہ مولانا ابوالاعلی مودودی سے متاثر ہوئے مگر ان کے شریک کار نہ بنے، لیکن اپنے علم وفکر کے ذریعہ جہاد میں مشغول رہے، تزکیہ نفوس اور تہذیب اخلاق میں ان پر صوفیانہ رجحانات کا غلبہ تھا اسلئے وہ سید عبدالقادر رائے پوری کے حلقوں میں بھی شریک ہوتے رہے، اسی لئے انہوں نے متعدد صوفیا ومشائخ پر مضامین بھی لکھے جو ان کی کتاب ''**رجل الفکر والدعوۃ فی الاسلام**'' میں شامل ہیں۔ دنیا کی متعدد اکاڈمیوں نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے وہ ''رابطہ عالم اسلامی'' مکہ مکرمہ کے بانی رکن اور ''**المجمع العلمی**'' دمشق کے بھی رکن تھے، نیز ''رابطہ ادب اسلامی'' کے بانی بھی تھے ان کو 1980ء میں ملک فیصل ایوارڈ سے اور 1988ء میں ''حاکم دبئی'' اور ''سلطان برونائی'' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

مولانا علی میاں دعوتِ اسلامی کے مبلغ

ڈاکٹر ابراہیم فائز استاد کلیۃ الشریعہ نے کہا: ''شیخ ندوی دعوت اسلامی کے بڑے علماء میں سے ایک تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں ہندوستان میں دعوتی کاموں کو بڑی وسعت دی، وہ ائمہ احادیث میں سے تھے، ان کی وفات سے

ہندوستان کی دعوتی سرگرمیاں یقیناً متاثر ہوں گی کیونکہ وہ خود ایک ایسا دبستان فکر تھے جو حکمت ودانائی، حسن تصرف اور خالص دعوت الیٰ اللہ سے مالا مال تھا۔ وہ وفات کے بعد امت اسلامی کے ان فاضل علماء میں شامل ہو گئے جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کے لئے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔

ڈاکٹر ابراہیم الوہبی، مساعد امین عام "الندوة العالمية للشباب الاسلامی" ریاض نے اس بات کی وضاحت کی کہ شیخ ندوی مربی داعیوں میں سے تھے، انہوں نے مسلمانوں اور اسلام کے لئے بڑی خدمات انجام دی ہیں، ان کی سیرت اور تصانیف اس بات کی روشن دلیل ہے کہ وہ ان عملی داعیوں میں سے تھے جن کا اثر ان کے جانے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ اور ان کی سرگرمیوں کا اثر "ندوۃ العلماء" کی خدمات کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے دسیوں کانفرنسوں میں شرکت کی اور وہ ان کانفرنسوں کے نمایاں مقرر تھے۔ تصنیف وتالیف میں بھی ان کا نمایاں حصہ ہے، ان کی بعض کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں، مثلاً "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" اور "الصراع بين التفكرة الاسلامية والفكرة الغربيه" اقبال کی بعض نظموں کے ترجمے اور نئی نسل کے لئے "السيرة النبوية" وغیرہ۔ ڈاکٹر خلیل حماد، استاد ملک سعود یونیورسٹی ریاض نے کہا: "شیخ ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی دعوت الیٰ اللہ کے سلسلے میں واضح خدمات اور انمٹ نقوش ہیں۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں، وہ دعوت الیٰ اللہ میں ایک نمایاں مدرسہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہوں نے مولانا مودودی کے ساتھ اسلام کی اشاعت میں اس وقت حصہ لیا جب اسلام غیر منقسم ہندوستان میں کمزور تھا، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان پر رحم وکرم فرمائے اور انکی مغفرت فرمائے اور انکو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

☆☆☆

مفسر قرآن

حضرت مولانا مفتی ذاکر حسن عبیدی رح پھلتی ۱؎

اس امت کا مزاج اور امتیاز رہا ہے کہ یہ صرف انہی تاریخی شخصیات کو اپنے دل میں جگہ دیتی ہے اور یاد رکھتی ہے جن کا دین سے تعلق رہا ہے، خدمت دین کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس راہ میں عمر عزیز اور جسم وجاں کی توانائیاں کھپائی ہیں۔ البتہ ممکن ہے کہ کسی کو اس کے اقتدار اور مال ومنال سے عزت وشہرت مل جائے لیکن اس کی عمر دھوپ وچھاؤں کی ہوتی ہے۔

لیکن دین کی نسبت سے جو مقام ومرتبہ ملتا ہے اس کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس عزت ووقار کو کبھی موت نہیں آتی۔ ان ہی میں سے خطیب العصر، فقیہ الملت، مصلح امت، قاضی شریعت مفسر قرآن کریم الحاج مولانا ذاکر حسن معروف بہ عبیدی صاحب رح ہیں جن کی مختلف دینی خدمات کے علاوہ قرآنی خدمات کے احسان گراں بار کا پورا شہر ممنوں ومرہون منت ہے۔ آج ان خدمات کو ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ مرور ایام اور انقلابات

۱؎ مولانا خورشید عالم ندوی، روزنامہ راشٹریہ سہارا، ۲۴؍جولائی ۲۰۱۱ء

زمانہ کے ملوں تلے اگر چہ یہ خدمات دب کر رہ گئی ہیں، لیکن اس کے تابندہ نقوش لوگوں کے دلوں میں اب بھی باقی ہیں اور ان کے لئے دل جذبہ امتنان وتشکر سے لبریز ہے۔

مولانا عبیدی کی خدمات نصف صدی پر محیط

مولانا عبیدی صاحب کی دینی خدمات بنگلور شہر میں کم وبیش نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ یہاں ایک عظیم محسن، مصلح، مبلغ مفسر اور سحر انگیز خطیب کے طور پر جانے جاتے تھے۔ جس دور میں یہاں آپ کی آمد ہوئی، وہ وقت کا اہم تقاضہ اور پکار تھی۔ بلکہ جن کو ان کی مصاحبت نصیب رہی ہے۔ یہاں ان کی آمد کو 'ایک غیبی اشارہ' سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ آج سے تقریباً 70 سال پہلے بنگلور غیر اسلامی رسوم ورواج اور نت نئے روایتی طور وطریقے اور اوہام وخرافات کی آماجگاہ تھا۔ انہی چیزوں کو یہاں سربلندی حاصل تھی۔ اس وقت یہاں آج کی طرح نہ مدارس ومکاتب کے جال پھیلے تھے، جس سے پھیلنے والی کرنیں اس تاریکی کو چاک کرتیں نہ کوئی ایسا مصلح قوم تھا جو عوام کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر صحیح مرض کی تشخیص کرتا۔ دعوت واصلاح کا کام اپنے روایتی انداز میں ہو رہا تھا۔ لیکن اس میں وہ قوت تسخیر نہیں تھی جو سادہ لوح دلوں کو تسخیر کر سکے۔

جمعہ مسجد میں مولانا کا تقریر

اس صورت میں کم وبیش 2000 کلومیٹر دور مسافت شمال کے شہر دہلی سے ایک پاک طینت، نیک طبیعت پارسا صفت درویش انسان نے یہاں کا قصد کیا جو دینی غیرت وحمیت کے نمونہ اور خلافت شریعت امور کے بیخ کن تھے۔

مولانا عبیدی صاحب 1907ء میں پھلت نگر یوپی میں پیدا ہوئے۔ نام ذاکر حسن تھا عقیدت ومحبت میں استاد کے نام سے عبیدی لیا اور دونوں کے اشتراک سے ذاکر حسن عبیدی کے نام سے معروف ہوئے۔ 1345 میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور یوپی سے تعلیمی فراغت حاصل کی اور 1941ء میں بنگلور تشریف لائے۔ چہرہ نورانی ،قد پست، جسامت میں دبلے پتلے، خوش طبع، خوش مزاج، پاک طینت پاکباز، خوش گفتار اور ملنسار تھے۔ مولانا کی یہاں آمد کے سلسلے میں تفصیلات دو عمر رسیدہ بزرگ شخص سے ملی ہیں۔ جناب ای محمد یوسف، مقیم ایس کے گارڈن اور جناب عبدالواحد صابری (عمر 82 سال)، مقیم احاطہ نو بہار شاہ، آرام اسٹرانگ روڈ شیواجی نگر، ان دونوں بزرگ حضرات کا مولانا سے قریبی تعلق رہا ہے اور تقریباً 45-40 سال کی رفاقت رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ جب یہاں آئے تو عبد الستار سیٹھ (کارپیٹ والے) کے یہاں مہمان ہوئے پھر بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا بیان 15/شعبان المعظم کی شب برات کو مسجد بیوپاریاں میں ہوا۔ حضرت کے پہلے ہی دل پذیر بیان نے دین کا احساس وشعور رکھنے والے چند احباب کے دل کو موہ لیا اور آپ ان کے دل میں اتر گئے۔ ان میں سید محمود صاحب، حاجی عبداللہ سیٹھ مرحوم جمعہ مسجد کے متولی تھے۔ مولانا عمر صاحب نے حاجی عبداللہ سیٹھ صاحب، متولی مسجد سے بات چیت کر کے حضرت والا کو امامت پر مقرر فرمایا۔ حضرت والا امامت وخطابت فرمایا کرتے تھے۔ بالخصوص بعد نماز مغرب حسبۃ اللہ چھ سال تک تفسیر قرآن فرمایا۔ قوم کی اصلاح کے پیش نظر سنت پر عمل کرنے کی خوبی اور بدعت کی برائیوں پر بیانات ہوتے رہے۔ لیکن فروعی مسائل کی بناء پر مسجد کی امامت سے مستعفیٰ ہو گئے۔ اس کے بعد چند روشن دماغ اور صالح مزاج بزرگوں اور نوجوان حضرات کی کاوشوں سے بمقام محمد علی ہال ویرا پلے اسٹریٹ معسکر بنگلور میں درس تفسیر قرآن پاک کا سلسلہ

شروع کیا گیا۔ای محمد یوسف صاحب - جنہوں نے 1985ء تک اس ادارہ کا انتظام وانصرام سنبھالا ہے۔ بتایا کہ پہلے تفسیر اولڈ بمبو بازار میں واقع ایک مدرسہ سے شروع ہوا جہاں عبیدی صاحب کے ایک شاگرد مولانا عبدالواحد قاسمی بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔تقریباً ایک سال تک وہاں یہ سلسلہ جاری رہا پھر وہاں سے محمد علی ہال ویرا پلے اسٹریٹ منتقل ہوگیا۔اس طرح 1468ھ، مطابق 1947ء میں یہ درس قرآن باضابطہ طور پر'ادارہ تفسیر قرآن عظیم بنگلور' کے نام سے ادارہ کی شکل اختیار کر گیا۔حسین سیٹھ صاحب ،عبدالحمید سیٹھ صاحب، سلیم سیٹھ صاحب ادارہ کا انتظامی امور سنبھالتے تھے۔ان حضرات کے بعد انتظامی ذمہ داری ای محمد یوسف صاحب اوران کے رفقاء کا عبد الکریم صاحب (مرحوم)، عبد الرحمان قریشی صاحب، عبد الواحد صابری صاحب کے ذمہ آئی۔ یہ حضرات عوام سے زرتعاون حاصل کر کے ادارہ کے انتظامی امور پر صرف کرتے تھے۔ ماہانہ اخراجات 200 یا اس سے کچھ زائد ہوتے تھے جو عوامی تعاون سے پورے ہوتے تھے۔

مولانا کی سحر بیانی

یوسف صاحب کے مطابق لوگ درس تفسیر میں جوق در جوق شریک ہوتے تھے۔ایک تو اللہ کا کلام تھا۔جس کے اسرار ورموز بیان کئے جارہے تھے۔الفاظ سے جب حکمت ودانائی اور علم ومعرفت کی پرتیں ہٹتیں تو ان کی آنکھیں خیرہ ہوجاتیں۔پھر حضرت کا پراثر انداز بیان، سحر انگیز خطابت، زبان کی حلاوت وچاشنی، سب پر جادو کا اثر کرتا اور لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔شیدائیان قرآن سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا۔ حتی کہ لوگ زینہ پر بیٹھ کر ہمہ تن گوش ہوکر سنتے۔ایمان افروز باتیں دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی تھیں۔

اسکی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ لفظ 'تفسیر' یہاں کیلئے ایک نامانوس اور اجنبی لفظ تھا۔ لوگ قرآن پاک تلاوت ضرور کرتے تھے لیکن تفسیر کیا ہوتی ہے اس سے ناآشنا تھے یا اس سے قبل انہیں ایسا موقع فراہم نہیں ہوا تھا جس میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کی جاتی ہو۔عوام کی تفسیر سے متعارف کرانے کا سہرا مولانا عبیدی صاحب کے سر جاتا ہے۔اس بات کا اعتراف کئی سن رسیدہ حضرات نے کیا ہے اور اس کی تصدیق بعض دیگر حضرات نے بھی کی ہے۔اس نسبت سے آپ کی گراں قدر خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ صابری صاحب (صدر مجلس تحفظ شریعت) جو کہ پیرانہ سالی کے سارے عام مسائل کے حصار میں گھرے ہیں۔قوت سماعت کا بھی بھرپور تعاون نہیں مل رہا ہے۔البتہ قوت بینائی اور یادداشت دونوں کا مشترکہ تعاون تاحال باقی ہے۔تاہم راقم کی درخواست قبول کر کے چند سطور لکھنے کی زحمت گوارا کی چنانچہ وہ رقم طراز ہیں کہ شروع زمانے میں ہفتہ کی شب 9 بجے تا 12 بجے حضرت والا کے اصلاحی بیانات ہوا کرتے تھے۔لیکن حضرت کی ناسازی طبیعت کے سبب اسے موقوف کر دیا گیا۔لیکن تفسیر کا سلسلہ روزانہ جاری رہا۔حتی کہ 45 سال تک چلا۔ پھر کبرسنی کے باعث ہفتہ میں صرف تین شب تفسیر ہوتی رہی۔ پھر اسے کم کر کے ایک شب کر دیا گیا۔ آخری مجلس میں واپسی کے وقت تمام حاضرے کیلئے دعاء کرتے ہوئے کہ آپ حضرات نے آخری وقت تک میرا ساتھ دیا، فرماتے ہوئے رخصت ہوئے۔ ؎

جس نے ابھارا خلق کو طاعت کردگار پر نقش اسی کا رہے گا صفحہ روزگار پر

۴۵ سالہ قرآنی خدمات کا احاطہ مشکل ہے

وہ مزید لکھتے ہیں کہ الحمد للہ ایک عالم دین کی بنگلور شہر میں آمد پر اور انکی ذوق طبیعت کے پیش نظر حضرات مولانا عبیدی پھلتی وصدیقیؒ کی حیات طیبہ کے تعلق سے

کچھ حالات پر روشنی ڈالنی پڑی ویسے حضرت والا کی 45 سالہ قرآنی خدمات کا احاطہ کرنا ہماری علمی بے بضاعتی اور پیرانی سالی کی ناتوانی مانع ہے۔ تاہم اس وقت خورشید عالم ندوی کی فرمائش پر چند سطور رقم کی گئی ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نوجوان عالم دین کی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین! ویسے واقعہ یہ ہے کہ شمال ہند کے برعکس جنوبی ہندوستان میں علماء وصلحاء امت کے کارناموں کا ذکر کرنے کا رواج نہیں ہے۔ آئندہ کیلئے ہم اہل علم حضرات سے عاجزانہ گزارش کرتے ہیں کہ قوم کے ہمدرد اور ملک وملت کا کام کرنے والوں کی خدمات کو کتابچے کی شکل میں شائع کریں''۔

تاہم درس تفسیر قرآن پاک کی جو شمع روشن کی، آج بھی وہ شمع فروزاں ہے۔ (الحمدللہ) حالانکہ حضرت عبیدی صاحب کے بعد کئی بار اسے ناسازگار حالات کا سامنا رہا لیکن ادارہ کے دردمند احباب نے کسی قیمت پر اس درس قرآن کے اس شمع فروزاں کو بجھنے نہیں دیا۔ شہر کے مختلف علماء کرام سے درخواست کر کے اس سلسلہ کو اب تک باقی رکھا گیا ہے۔

یوسف صاحب نے بتایا کہ جب بھی یہ سلسلہ منقطع ہوا، میں خود حضرات علماء کرام کی خدمت میں پہنچ کر ان سے درس تفسیر قرآن دینے کی درخواست کی۔ اب تک اس ادارہ کو بالترتیب درج ذیل علماء کرام کی خدمات حاصل رہی ہیں۔: مولانا قادر حسین صاحب (حیدرآباد)، مولانا مفتی شعیب اللہ خاں صاحب (مہتمم جامعہ مسیح العلوم)، مولانا فرید الدین عمری صاحب (مہتمم مدرسہ عربیہ کمبی پور)، مولانا لطف اللہ صاحب رشادی (خطیب وامام مسجد قادریہ) اب مولانا اسلام انجم صاحب امام وخطیب مسجد لبابین معسکر بنگلور ہر جمعہ شب 9:30 تا 10 بجے تفسیر بیان کرتے ہیں۔ اور رمضان المبارک میں مرکزی جامع مسجد میں مولانا حکیم محمد ادریس حبان رحیمی نے کم وبیش پچیس سال تفسیر قرآن کی خدمات انجام دیں اب ان کے

صاحبزادے مولانا حکیم محمد عثمان حبان دلدار قاسمی اس مبارک خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔ اب بھی اہل ذوق حضرات شریک ہوتے ہیں۔

مولانا عبیدی کا دوسرا اہم کارنامہ

حضرت مولانا عبیدی صاحب کا دوسرا اہم کارنامہ مجلس تحفظ شریعت اسلامیہ بنگلور کا قیام ہے۔ یہ ادارہ 1393ھ مطابق 1973ء میں بمبو بازار میں قائم کیا گیا تھا۔ ادارہ کے پیش نظر جو مقاصد تھے وہ اس طرح ہیں: اسلام پر اعتراضات کا جواب دینا، اسلامی عقائد اور احکام کی حفاظت میں سعی کرنا، باطل فرقوں کا رد کرنا، نیک کاموں کی رغبت دلانا اور برے کاموں سے روکنے کی کوشش کرنا، بری رسموں بدعتوں اور غلط عقیدوں کی اصلاح کرنا، اتباع سنت کی ترغیب دینا اور مسلم پرسنل لا کی حفاظت میں تعاون کرنا وغیرہ۔ اس ادارہ کو اکابر علماء ہند کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ ان اکابرین میں مولانا سید فخر الحسن (صدر المدرسین دار العلوم دیوبند)، سید شاہ منت اللہ رحمانی (امیر شریعت بہار واڑیسہ ومہتمم جامعہ رحمانیہ مونگیر وجنرل سکریٹری مسلم پرسنل لاء بورڈ) عارف باللہ مولانا محمد مسیح اللہ صاحب (مہتمم مدرسہ عربیہ مفتاح العلوم، جلال آباد ضلع مظفر نگر) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنو)، مولانا سید انظر شاہ صاحب (استاد تفسیر دار العلوم دیوبند) ومولانا مفتی عتیق الرحمان (ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی) کے اسماء گرامی درج ملتے ہیں۔

بدعات اور خرافات کی مخالفت

اس ادارہ کو مولانا عبیدی صاحب نے بہت سرگرم اور فعال طور پر چلایا۔ اس پلیٹ فارم سے سماج میں پھیلی بہت سی برائیوں اور نت نئے رسم ورواج کے خلاف

جنگ چھیڑ دی تھی۔ ہر ممکن طریقے سے اس کا سد باب کیا۔ معاشرہ میں ناسور بن کر پھیلتی سماجی ومعاشرتی برائیوں کے خلاف تحریری طور پر قرآن وحدیث کی روشن میں مدلل طور پر آپ نے کارروائیاں لکھیں اور اسے عوام میں تشہیر کیا۔ ان کارروائیوں کا مجموعہ نہایت بوسیدہ شکل میں راقم کو دستیاب ہوا ہے۔ اس میں شادی بیاہ کے موقع پر پروان چڑھتیں، غیر اسلامی رسومات کو خطرناک قدم کے عنوان سے 15/شعبان میں نوجوانوں کی بے ہودہ حرکتیں، پردہ اور قرآن، پردہ اور ترقی، فرمائشی جہیز کا شرعی حکم جیسے عنوانات سے 33 مفصل کارروائیاں لکھی ہیں۔ اس دور میں ایک اہم مسئلہ بہ متعلق فلم ''خانہ خدا'' دیکھنے یا نہ دیکھنے کا اٹھا تھا۔

اس باب میں آپ نے بڑی وضاحت اور مدلل انداز میں اس کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں تحریر فرمایا تھا۔ یہ فتویٰ شہر وبیرون شہر کے مشاہیر علماء کرام، مفتیان عظام وائمہ مساجد کی تصدیقات کے ساتھ شائع ہوا تھا۔

ان میں جناب ارشاد احمد مبلغ دارلعلوم دیوبند، ابوصالح عبدالجمیل الخطیب باقوی کے علاوہ حضرت مولانا ابوالسعود احمدؒ (دارالعلوم سبیل الرشاد) وحضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب (مفتی دارالعلوم سبیل الرشاد) نیز مولانا محمد یحییٰ صاحب (مہتمم وبانی مدرسہ اشرفیہ بنگلور) کے نام آتے ہیں۔

استفتا: کیا فرماتے ہیں علمائے شریعت مسئلہ ذیل میں کہ مناسک حج کی ایک فلم بنام 'خانہ خدا' بنائی گئی ہے۔ جس میں تمام افعال ومناسک حج کی نقل اتاری گئی ہے۔ اس کا دیکھنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز بعض حضرات نے جو یہ فتویٰ دیا ہے کہ فلمی تصاویر پر چھائیں ہوتی ہیں، اس لئے سنیما جائز ہے، یہ کہاں تک صحیح ہے اور اس کی کیا حقیقت ہے؟..... (السائل: عبدالواحد صابری، سکریٹری تنظیم حزب اللہ بنگلور-۱) اس اہم فتویٰ کا منتخب اقتباس ذیل کے باکس میں ملاحظہ کریں۔

مولانا عبیدیؒ کو سپاس نامہ

12/مارچ 1986ء میں مدرسہ عربیہ سراج العلوم واقع میسور روڈ بنگلور 2 کا جلسہ دستار بندی حفاظ منعقد ہوا تھا۔ اس موقع پر حضرت مولانا عبیدی صاحب جلسہ کی صدارت کیلئے مدعو کئے گئے تھے۔ اس موقع پر مولانا مختار احمدؒ بانی مدرسہ عربیہ سراج العلوم نے حضرت والا کی خدمت میں بڑا وقیع، جامع اور نہایت خوبصورت الفاظ میں سپاس نامہ پیش کیا تھا۔ یہ سپاس نامہ جہاں اپنے پہلو میں آپ کی دینی خدمات کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے وہیں آپ کی عظمت ورفعت اور اہل شہر کے دل میں آپ کیلئے جو مقام ومرتبہ تھا۔ اسکا ترجمان اور آئینہ دار ہے۔ طوالت سے بچنے کیلئے سپاس نامہ کا صرف اخیر کا حصہ من وعن آپ قارئین کی پیش خدمت ہے:

'حضرت صدر محترم!...آپ ہی کی سعی مشکور نے جنوب اور شمال کے خلا کو پر کیا۔ اور توحید وحق پرستی کی گلکاری کی۔ مسلک اہل سنت والجماعت کی صحیح ترجمانی کی، مشرکانہ رسوم وبدعات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور یہاں کے مسلمانوں کو مسلک حق کے صحیح مقام سے روشناس کیا۔ اکابر دارالعلوم دیوبند کو بلا بلا کر جواں مردی اور اولوالعزمی کیساتھ بیانات کروایا۔ چنانچہ مولانا ارشاد احمد صاحب مبلغ دارالعلوم دیوبند کو بلوا کر مسلک حق دیوبندی نقطہ نظر سے لوگوں کو آگاہ کرایا اور مسلمانوں کو علمائے حق کے قریب کیا۔ اسکے بعد شیخ العرب والعجم بطل حریت حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب نور اللہ مرقدہ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند، نیز قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین مسیح الامت حضرت مولانا الشاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ اور ان جیسے اکابر کے آنے کا سلسلہ قائم ہوا۔ یہاں تک کہ آج ہمارے سامنے وہ گھڑی بھی آئی جس میں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ

کے معزز اراکین کا ایک وفد ہمارے شہر بنگلور میں از دیار بہار وسکون بنا ہوا ہے۔ عالی مقام خطیب العصر!..... یہ سب آپ ہی کی مساعی جمیلہ کا فیض ہے جو بنگلور میں علم وعرفاں کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ اگر ایک طرف حضرت والا اپنے خطبات ودل پذیر سے گرمی محفل کا سامان بہم پہنچا رہے تھے۔ اور دوسری طرف آپ کی گراں قدر تصنیفات سامان ہدایت پیدا کر رہی تھیں۔ جس کی گواہی آپ کی تصنیفات: خطبات موعظت، علم العقائد، تنویر المصابیح، اشراق المصابیح، تحقیق المفید، وغیرہ دے رہی ہیں۔ یہ آپ کا ایسا صدقہ جاریہ ہے کہ انشاء اللہ تا قیامت اس کا اجر عظیم حضرت والا کو پہنچتا رہے گا۔ اے مجاہد اسلام!..... فتنہ قادیانیت سے نبرد آزمائی کے لئے تحفظ ختم نبوت کی بنیاد سرزمین بنگلور میں آپ ہی نے ڈالی۔ یہاں تک کہ وہ فتنہ عظیم حضرت مولانا ریاض احمد صاحب کی ہمنوائی سے انجام بد کو پہنچا۔ تقریباً 13 سال تک مجلس تحفظ شریعت کی نگرانی فرماتے رہے۔ جس کے مقاصد میں اسلام پر اعتراضات کا جواب دینا، اسلامی عقائد واحکام کی حفاظت میں سعی کرنا وغیرہ ہے۔ مجلس تحفظ شریعت کی جانب سے اب تک کارروائی 33 تک ملت اسلامیہ کے آگے علماء حق کے ایمان افروز بیانات، اصلاحی کتابچے شائع کر کے مفت تقسیم کئے جا چکے ہیں۔

نامی گرامی صدر عالی!..... ہم جو کچھ بیان کر چکے ہیں، بہت کم ہے اور جو نہیں بیان کر سکے، وہ بہت زیادہ ہے وقت کی قلت مزید اجازت نہیں دیتی۔ بس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تادیر آپ کے طفل وعاطفت کو ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ (آمین ثم آمین).....(تحریک صدارت مطبوعہ زیر اہتمام مجلس تحفظ شریعت، سن 1986)

بتایا جاتا ہے کہ ابتدائے ایام میں آپ کی دینی سرگرمی کو دیکھ کر بعض مخالف لوگوں نے دھمکیاں بھی دیں اور مختلف طریقوں سے تکلیف دینے کی کوشش کی۔ لیکن آپ کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل اور جنبش نہیں آئی۔ پوری پامردی کے

ساتھ اپنے مشن میں لگے رہے۔ یہ بھی سنا گیا ہے کہ بعض سیاسی لوگوں نے سیاسی مفاد کے خاطر اس جانب لانے کی کوشش کی، لیکن ان کی کوشش حضرت کی غیرت دینی اور حمیت اسلامی پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ اور ناکام ونامراد ٹھہرے۔ ریاست میں جب بھی کسی کی یہاں آمد ہوتی، وہ آپ سے ملنے کے مشتاق ہوتے۔ گاندھی جی کے مصاحب اور رفیق عبد الغفار صاحب جو کہ وقت کے منسٹر تھے۔ آپ سے خصوصی ملاقات کی۔ اس کے لئے یتیم خانہ اہل اسلام میں بندوبست کیا گیا تھا۔ بقول ای محمد یوسف صاحب، (قدیم خادم ادارہ تفسیر القرآن) مولانا عبیدی صاحب پہلے پہل تنہا آئے تھے، اس وقت جواں سال تھے۔ بعد میں چل کر اہل وعیال کو بھی لے آئے۔ جامع مسجد میں خدمت کے دوران ڈسپنسری روڈ میں قیام گاہ ملا تھا۔ جب یہاں کی ذمہ داری سے دستبردار ہوئے تو اسے چھوڑ کر بمبور بازار میں مکان لیا۔ اپنی قیام گاہ پر بھی لوگوں کو حدیث اور فقہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ آپ کے ایک بڑے بھائی راغب حسین تھے۔ جو کمہار پیٹ مسجد میں امامت کرتے تھے۔ آپ کے چار صاحبزادے تھے۔ ان میں ایک کا نام مولانا ناصر حسن عبیدی تھا، جو عالم دین تھے۔ بنر گٹہ روڈ کے قریب چن پالیہ علاقہ میں مقیم ہوئے اور آخری ایام میں مولانا حکیم محمد ادریس حبان رحیمی کے توسل سے آپ کو مسجد یقیں شاہ ولی میں خطیب وامام بنایا گیا اور کوثر نگر میں گھر بنا کر آخر تک وہیں مقیم رہے۔ مولانا ذاکر حسن عبیدی اس شہر کو بدعات وخرافات کے تسلط سے آزاد کرا کر 1989ء میں اپنی خدمات کے لازوال نقوش سپرد اہل شہر کر کے کوچہ رحمت ایزدی میں پناہ گزیں ہوئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) تدفین چن پالیہ کے قریب واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔ اللہ غریق رحمت کرے۔

☆☆☆

محی السنہ حضرت شاہ ابرارالحق صاحب ہردوئیؒ [۱۸]

دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگ اکابر اور مشائخ کی مجالس میں جا کر اپنی معلومات اور اپنی قابلیت اور صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ان کو مجلس کے آداب سے واقفیت نہیں ہوتی بس وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میری باتوں سے حضرت کو خوشی ہوگی اور میری صلاحیت کا علم ہوگا حالانکہ ایسے لوگ نرے جاہل ہوتے ہیں۔

داناؤں کا قول ہے کہ علماء کی محفل میں بیٹھو تو زبان سنبھال کر بیٹھو، حاکم کی محفل میں بیٹھو تو نگاہیں سنبھال کر بیٹھو اور اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھو تو اپنے دلوں کو سنبھال کر بیٹھو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لمبی زبان انسان کی عمر کو چھوٹا کر دیتی ہے کیونکہ جتنا زیادہ بولے گا اتنا اپنے سر پر زیادہ مصیبت مول لے گا۔

حضرت خواجہ باقی اللہؒ بہت کم گو تھے ایک آدمی کہنے لگا کہ حضرت آپ نصیحت کریں ہمیں فائدہ ہوگا، حضرت نے جواب دیا جس نے ہماری خاموشی سے کچھ نہیں پایا وہ ہماری باتوں سے بھی کچھ نہیں پائے گا۔سبحان اللہ کیا عجیب بات کہی۔

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

۱۸ تحریر: محمد ادریس حبان رحیمی بنگلور

حضرت شاہ ابرارالحق صاحبؒ بنگلور تشریف لائے اور السور کے قریب الحاج ہاشم سیٹھ کے بنگلہ پر حضرت کا قیام رہا اس دوران بندہ ناچیز الحاج ناصر سیٹھ مرحوم کے ساتھ حضرت سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا، اس وقت حضرت والا دوپہر کا کھانا تناول فرما رہے تھے میں نے سلام نہیں کہا، خاموش بیٹھ گیا حضرت اکیلے کھانا نوش فرما رہے تھے، حضرت شاہ صاحب نے ہم لوگوں کو کھانے کے لئے نہیں فرمایا کھانے سے فراغت کے بعد میں کھڑا ہو گیا اور حضرت کو سلام کیا حضرت والا بہت خوش ہوئے فرمایا معلوم ہوتا ہے کی تمہاری تربیت ہوئی ہے۔

حضرت نے وضو فرمایا میں نے عرض کیا اجازت عطا فرمادیں تو میں آپ کے پاؤں سے پانی صاف کردوں حضرت نے بخوشی اجازت دی، پھر کچھ گفتگو فرمائی، دورانِ گفتگو حیدرآباد سے علماء کرام کی ایک جماعت آگئی حضرت نے فرمایا ان کو الگ بٹھائیں میں مولانا حبان سے بات کر رہا ہوں بہت مختصر مختصر کلمات حضرت نے ارشاد فرمائے میں نے واپسی کی اجازت چاہی تو فرمایا ابھی ٹھہرو، حضرت والا اٹھے اور لنگی کے بجائے پائجامہ زیب تن فرمایا اور عصا ہاتھ میں لیا فرمایا اب چلو۔حضرت والا علیل تھے آرام وراحت کی غرض سے بنگلور تشریف لائے تھے میں نے سوچا حضرت کو بھی کہیں باہر جانا ہے۔حضرت والا بالاخانہ سے نیچے اترے اور پھر صحن سے چل کر مین گیٹ تک آئے اور رک گئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر ارشاد فرمایا، اچھا اب جاؤ۔فی امان اللہ

بندہ نے عرض کیا حضرت نے زحمت فرمائی کہ آپ یہاں تک اس علالت میں تشریف لائے؟ فرمایا یہ نسبت کا احترام ہے۔اللہ اکبر!

نہ کوئی لمبا چوڑا تعارف، نہ کوئی طویل بات چیت نہ کوئی درمیان میں واسطہ، یہ اہل نظر کا حال ہے، بندہ اپنی بدعملی پر رو دیا۔اللہ اکبر حضرت والا نے کتنا کرم فرمایا اور نظر التفات سے نوازا۔اللہ تعالی حضرت والاؒ کے درجات کو بلند فرمائے۔آمین! تو

معلوم یہ ہوا کہ اہل اللہ کے پاس دل کو سنبھال کر بیٹھو جب دل درست ہوگا تو دل والے محبت سے پیش آئیں گے۔ (محمد ادریس حبان رحیمی)

وضاحت: کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ دوسرے کے دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے والے کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے کسی دوسرے کو کھانے میں شامل کرے، البتہ میزبان سامنے ہے وہ اجازت دے تو مہمان اس کو اپنے ساتھ شریک کرسکتا ہے اس لئے حضرت والا تنہا تناول فرماتے رہے کیوں کہ میزبان سامنے نہیں تھا اور پھر حضرتِ والا کا اس دوران پرہیزی کھانے کا اہتمام تھا۔

حضرت والا کی ایک قیمتی نصیحت

ماضی قریب کے خدا ترس علماء اور بزرگوں میں حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی ممتاز اور بعض حیثیتوں سے منفرد شخصیت کے حامل ہیں۔ محی السنۃ (سنت کو زندہ کرنے والا) ان کا لقب ہے، یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ لقب کس نے اور کب دیا، تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت نے پوری زندگی سنتوں کو زندہ رکھنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، میرے محدود مطالعہ میں بیسوی صدی عیسوی میں بہت کم ایسے افراد پیدا ہوئے جو سنتوں کو عام کرنے اور شب و روز کے معمولات کو سیرت نبوی کے تناظر میں ڈھالنے کے لئے اپنے پہلو میں درد دل رکھتے ہوں، علماء اور عوام کو غلطیوں پر براہ راست ٹوکنے اور فوری طور پر ان کو متوجہ کرنے کا رجحان تقریباً ختم ہو چکا ہے، مصلحت پسندی اور موقع پرستی کے بہانے بسا اوقات مداہنت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ جو نہایت افسوسناک ہے، حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کو اس معاملے میں بھی امتیازی شان حاصل تھی، اہل ثروت کی مالداری، عہدیداروں کے عہدہ اور قرابت داروں کی قرابت کا لحاظ کئے بغیر ہر خلاف سنت کام پر ٹوکنا ان کا معمول تھا، ایسا ممکن

نہیں تھا کہ ان کی موجودگی میں طریقہ سنت کے خلاف کوئی کام کیا جائے یا خلاف شریعت کسی بات کا ان کو علم ہو اور خاموش رہیں یا کسی مناسب موقع کی تلاش میں دل میں ان باتوں کو جمائے رکھیں، یہ تربیت کا ان کا اچھا انداز تھا کہ فوری طور پر وہ ٹوک دیا کرتے تھے، مخاطب پر اس کا بہتر اثر پڑتا اور وہ ہمیشہ کے لئے اس کام کو ترک کر دیتا، اس طرح نہ جانے کتنے افراد سنتوں کے عاشق ہو گئے، حضرت محی السنۃ سنت کے خلاف امور پر ٹوکتے بھی تھے اور قدم بہ قدم اپنے مریدین اور عقیدت مندوں کو نصیحت بھی کرتے، بزرگوں کا یہی وہ اصلاحی طریقہ ہے، جس سے لاکھوں انسان خدا سے قریب ہوئے اور گمراہ کن راستوں سے نجات پا کر جوار رحمت خداوندی میں جگہ پائے، ذیل کے سطروں میں ایسے ہی ایک مختصر مگر وقیع اور پر تاثیر نصیحت کا تذکرہ مقصد ہے، جو حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سفر کے دوران اپنے رفقاء سے کی تھی جس میں آج بھی غور کرنے والوں کے لئے غیر معمولی درس عبرت اور عظیم انقلابی کیفیت پوشیدہ ہے۔

خدا کی معرفت اور آخرت کی یاد

ریاست آندھرا پردیش کی جمعیت علماء ہند کے صدر حافظ پیر شبیر احمد (ایم ایل سی) کا بیان ہے کہ ''میں ایک مرتبہ حضرت محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ریاست آندھرا پردیش میں اضلاع کا سفر کر رہا تھا، بہت سے مریدین اور رفقاء شریک سفر تھے، طویل وقفے کے بعد کسی ضرورت سے ایک آبادی میں گاڑی رکی، میں قریب کی دکان پر گیا اور کچھ مونگ پھلی خرید کر ڈرتے اور سہمے ہوئے حضرت کی خدمت میں پیش کئے کہ اس سے طبیعت میں کچھ تازگی پیدا ہوگی، اور آگے سفری تعب و تھکن کا احساس کم ہوگا، حضرت نے اسے قبول فرمالیا، کھانے کے ارادے سے پہلی مونگ پھلی ہاتھ میں لے

کرتوڑا تو اتفاق سے دو خالی تھی، اس میں دانہ نہیں تھا، بزرگوں کی نگاہیں دوررس ہوتی ہیں، دنیا کی ہر چیز میں انہیں خدا کی معرفت اور آخرت کی یاد نظر آتی ہے اور وہ اس طرح دنیا کے اسباب ووسائل کو بھی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، یہی فرق ہے اولیاء اور دوسرے لوگوں میں، حضرت محی السنۃ رحمۃ اللہ علیہ نے مونگ پھلی کو دانہ سے خالی دیکھا تو اس میں بھی انہوں نے نصیحت کا پہلو نکال لیا، تمام مریدین اور حاضرین کو اپنے پاس بلایا اور سوال کیا، بتاؤ! یہ مونگ پھلی پیسے میں تولی گئی یا مفت حاصل ہوئی، لوگوں نے کہا یہ تو پیسوں میں تولا گیا ہے، فرمایا: غور کرو اس میں دانہ نہیں ہے، اس نے صرف مونگ پھلی کی شکل بنائی تو یہ مونگ پھلی کے دام میں تولا گیا، اگر مسلمان بھی کم سے کم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اولیاء اللہ کی شکل وصورت بنالیں تو خدا کی رحمت سے امید ہے کہ قیامت کے دن یہ بھی ان کی قیمت میں تولے جائیں اور محض ان کی وضع قطع اور شکل وصورت بنانے کی وجہ سے ان کے صدقے میں مغفرت کا اعلان کر دیا جائے''۔

نصیحت اور مثال بظاہر مختصر ہے

یہ نصیحت اور مثال بظاہر مختصر ہے مگر انتہائی جامع اور معنی خیز ہے، غور کی نظر اس حقیقت کو پاسکتی ہے کہ اس میں اسلامی لباس، اسلامی رہن سہن اور شرعی وضع قطع اور طور طریقے اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اعمال میں ایک انسان جیسا بھی ہو، ایک مسلمان کا کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، شادی بیاہ، غرض زندگی کے تمام گوشے اگر اسلامی ڈھانچے کے مطابق ہوں تو کوئی بعید نہیں کہ عمل میں نقص اور کمی کے باوجود اللہ تعالیٰ معاف کر دے، اس میں شبہ نہیں کہ دل کی پاکیزگی، اخلاص وللّٰہیت، ایمان ویقین محور ہے، جس کے اردگرد ایک مسلمان کے تمام اعمال گردش کرتے ہیں، ظاہر بہتر ہو مگر ایمانی کیفیت سے دل خالی ہو تو محض ظاہری صورت کے بہتر اور اسلامی

ہونے سے نجات نہیں مل سکتی، یہی وجہ ہے کہ منافقین کے بارے میں قرآن نے سخت وعید بیان کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْرًا''۔ (النساء:۱۴۵) ''یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے''۔

ظاہر کا اثر باطن پر

حالاں کہ منافقین بظاہر مسلمان تھے وہ اسی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، جہاں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرتے تھے۔ لیکن دل ان کا ایمان سے خالی تھا، خدا کی عظمت اور روحانیت کے وہ معترف نہیں تھے، اس لئے ظاہر ان کا بہتر ہونے کے باوجود وہ وعید کے مستحق قرار دیئے گئے، اس سے معلوم ہوا کہ اخلاص وتقویٰ اور قلبی یقین کے بغیر ظاہر کا اعتبار نہیں، تاہم اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شریعت نے اندرونی اور قلبی ایمان ویقین کے ساتھ ظاہری لباس، وضع قطع کا بھی اعتبار کیا ہے، دنیا میں بھی اگر غور کیا جائے تو ہر شعبے میں اس کا اثر محسوس ہوگا، ٹریفک پولیس کے عملہ اپنے خاص لباس میں ملبوس رہیں تو ان کے اشارے سے وزیر اعظم کی چلتی ہوئی گاڑی بھی رک جاتی ہے اور وہ اپنی وردی میں نہ ہوں تو ایک معمولی آدمی کے لئے بھی ان کا حکم کارگر نہیں ہوتا، اسی طرح وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر اور انجینئر وغیرہ اگر اپنے مخصوص لباس میں ہوں تو اس کا ایک خاص اثر پڑتا ہے، جو بغیر لباس مرتب نہیں ہوتا، حالانکہ آدمی اور شخصیت وہی ہے، جو لباس کی شکل میں ہے، مگر ظاہری پوشاک، لباس اور وضع قطع نہ ہونے سے شخصیت پر تاثیر نہیں ہوتی۔ شریعت اسلامی نے بھی مسلمانوں کیلئے ظاہری وضع قطع خاص کیا ہے، مردوں کیلئے داڑھی رکھنے اور مونچھ کتروانے کا حکم ہے، اسی طرح ازار ٹخنے سے اوپر

پہننے کو واجب قرار دیا گیا ہے، ٹخنے سے نیچے کوئی قصداً ازار پہنتا ہے تو اس کیلئے سخت وعید بیان کی گئی ہے، عورتوں کو خاص طور پر حکم دیا گیا ہے کہ وہ باریک لباس نہ پہنیں، جس سے جسم کے اعضاء نظر آتے ہوں یا اتنا سخت اور فٹ لباس، نہ ہو کہ جسم کی ساخت نظر آئے، ایسی عورتوں پر رسول اکرم ﷺ نے لعنت بھیجی ہے، ظاہر ہے کہ جس پر لعنت منقول ہو وہ اسلامی لباس نہیں ہوسکتا، سر کے بال عورتوں کو بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے کہ اسی میں ان کے لئے فطری حسن ہے اور مردوں کو کٹوانے کی اجازت ہے، لیکن اس تفصیل کے ساتھ کہ "**احلقوا کلہ او اترکوا کلہ**" (صحیح مسلم) یعنی پورے سر کے بال یکساں طور پر یا تو کتر واؤ، یا پورے سر کے بال یکسانیت کے ساتھ چھوڑ دو، انگریزوں کی طرح ایسا نہ ہونا چاہئے کہ سامنے کے بال بڑے ہوں اور پیچھے کے چھوٹے یا بیچ کے بال بڑے ہوں اور چاروں جانب سے نیچے کے حصے میں چھوٹے بال ہوں، یہ طریقہ انگریزی تہذیب کا حصہ ہے اور افسوس کہ مسلمانوں میں یہ بھی طریقہ تیزی سے رواج پا رہا ہے، ایک مسلمان کو تو وہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے جو سنت سے ثابت ہو، اس میں حقیقی زینت ہے اور اتباع سنت کا ثواب بھی۔

ان مٹ نقوش گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں جو رہ رہ کر آنے والی نسل کو انکی دور بینی، بالغ نظری اور عظمت رفتہ کی یاد دلاتا ہے اور تاریخ کے صفحات میں سنہرے حروف میں رقم ان کارناموں کو پڑھ کر یادوں کا سیلاب امڈ آتا ہے۔ قدیم میسور ریاست کی با اثر شخصیات میں ایم جی مہکری کا نام محتاج تعارف نہیں لیکن امتداد زمانہ کے سبب ان کا نام وقت کے ملبوں میں دب کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ ان کے خاندانی سلسلہ کی ہندوستان میں ایک تاریخ رہی ہے۔ بحر کیف محمد غلام محی الدین مہکری معروف بہ ایم جی مہکری، ان شخصیتوں میں سے تھے، جنہیں اللہ نے کئی دماغی بخششوں سے نوازا تھا۔ کئی خصوصیات کے مالک تھے۔ دوست اور دشمن سب نے ان کی مدبرانہ

فراست، انتظامی صلاحیت اور مشکل حالات میں معاملہ پر قابو پانے کی غیر معمولی استعداد کا اعتراف کیا ہے۔

پورا نام محمد غلام محی الدین مہکری تھا۔ مہکری کی خاندان کے ہونہار اور روشن چراغ تھے۔ پیدائش میسور میں آبائی متمول خاندان میں ہوئی جو کئی پشت سے چلا آرہا تھا۔ یہ کوئی 18 ویں صدی کے نصف بعد کا زمانہ تھا۔ دادا کا نام سرامیر بدرالزماں خان تھا جو کرشنا راجہ وڈیار کورٹ میں عملدار کے نام سے جانے جاتے تھے۔

مہکری کی شاہانہ بود و باش

اس زمانے میں عام رواج تھا کہ شاہی دربار سے جڑے افراد کے بچوں کو شاہی دربار کے زیر نگرانی تربیت دی جاتی تھی۔ چنانچہ مہکری صاحب کو صغریٰ یعنی چھ سال کی عمر سے ہی شاہی دربار کی پر تعیش، شاہانہ بود و باش کی آب و ہوا ملی۔ بایں طور پر جب وہ چھ سال کے تھے تبھی میسور شاہی دربار کے یوراجا کے ساتھ ان کی بھی تربیت ہوئی اور اسی شاہی دربار کے خوش و خرم ماحول میں تعلیمی نشو و نما پائی۔ اس زمانے میں شاہی خاندان کا اسکول وہاں تھا جہاں جولوجیکل گارڈن واقع ہے۔ آگے چل کر میسور یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پھر وہیں سے بدستور ایل، ایل، بی کیا۔ اسی دوران ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے یوراجا کے پرائیوٹ سکریٹری مقرر ہوئے، نیز پرنس جے چارمراجیند رڈویار کے اتالیق بھی ہوئے۔ پرائیوٹ سکریٹری ہونے کے ناطے یوراج اور اس کے اہل خاندان کے ساتھ انگلینڈ کا سفر کیا۔ لیکن جب دوسری جنگ عظیم کی آگ بھڑک اٹھی تو ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوئی کہ اس شاہی خاندان کو بحفاظت ہندوستان واپس لائے۔

ایم جی مہکری نے میسور کے ڈپٹی کمشنر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی ہیں۔اس وقت میسور پر انگریزوں کی غاصبانہ نظر جمی ہوئی تھی اور اس پر تسلط جمانے کی تاک میں تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے ملک میں جدوجہد آزادی کی لہر چل رہی تھی۔ پورا ملک گاندھی جی کے ستیہ گرہ تحریک میں شامل تھا۔تحریک کی لہر میسور بھی پہونچنے والی تھی۔ یہاں اس تحریک کی قیادت کے لئے میسور کانگریس پوری طرح تیار تھا۔ بالآخر اپریل 1938ء میں مدور کے شیوا پورا نامی مقام پر میسور کانگریس نے اوندھے پڑے گنے کے کھیت میں ستیہ گرہ کا جھنڈا گاڑ دیا۔میسور کانگریس کا واحد مقصد برٹش تاناشاہی حکومت کی مزاحمت اور یہاں ناجائز تسلط کے پنجے گاڑنے سے روکنا تھا۔اس وقت ایم جی مہکری ضلع مجسٹریٹ تھے۔ یہ نہ تو ستیہ گرہ کی کھل کر حمایت میں تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ یہاں خون خرابہ ہو اور خون کی ہولی کھیلی جائے۔

مہکری صاحب کی دوراندیشی

برٹش کی ظالم فورس کی قیادت ہمیلٹن کررہا تھا۔ چنانچہ برٹش فورس نے فلیگ پوسٹ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تاکہ میسور کانگریس جھنڈا لہرانے سے باز آجائیں۔ برٹش فورس احتجاجیوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کرنے پر آمادہ تھے۔ایسی نازک گھڑی میں ایم جی مہکری کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہاں خون کی ندی نہ بہہ جائے۔میسور مہاراجہ کا امن وسلامتی کا یہ گہوارہ جو پرامن اور سلامتی کے لئے تاریخ کے صفحات میں اپنا نام درج کراچکا تھا، کہیں یہ واقعہ اس کی تاریخ کو مسخ نہ کردے۔ چنانچہ ہر قسم کی بدامنی اور شر وفساد کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کی اور بڑی حکمت ومصلحت سے کام لیتے ہوئے منڈلاتے ہوئے اس خطرہ کو ٹال دیا۔ وقت کے دیوان سرمرزا اسماعیل نے اپنے ماتحت افسر مہکری صاحب کو حکم دیا کہ جب

کانگریس جھنڈا لہرانے کی کوشش کریں تو احتجاجیوں کو قید کرلیا جائے۔ زیر حراست لوگوں کو محفوظ مقام پر کھڑی پولس گاڑی تک پہنچا دیا جائے جو کہ جائے واقعہ سے تھوڑا فاصلہ پر ہے۔ایم جی مہکری صاحب کی اس دانشمندانہ اور مصلحت پسندانہ حکمت عملی پر برٹش آفیسر بھڑک گیا اور اس نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے میسور مہاراجہ کو ایم جی مہکری کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی۔ لیکن مہاراجہ چونکہ بڑا دور اندیش اور صاحب بصیرت انسان تھا، اس نے اپنے معتمد افسر سے اس بابت وضاحت طلب کی۔اس پر ایم جی مہکری نے پورے اطمینان اور انکساری کے ساتھ وضاحت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''احتجاجی ریوینیو کی زمین پر اکٹھا تھے نہ کہ سرکاری زمین پر۔مزید یہ کہ وہ سب کے سب نہتے اور پرامن تھے''۔مہاراج میسور نے مہکری صاحب کے اس دوراندیشی پر مبنی فیصلہ اور حکمت عملی سے غایت درجہ متاثر ہوکر 'معتمد الملک' کا خطاب دیا۔اس موقع پر مہاراجہ نے انتہائی مسرت اور اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایک بڑا حادثہ ٹل گیا اور بہت سی قیمتی جانیں بچ گئیں۔فرط مسرت میں خوشی کے جذبات سے مغلوب ہوکر اس نے اپنی انگلیوں سے تین نگ نکالے اور اسے محو حیرت کردینے والے ایم جی مہکری کو بطور تحفہ دے دیا۔ان کا یہ عمل ممکن ہے اظہار تشکر ہو یا ان کی تعریف وتوصیف میں دیا ہو جو کہ انہوں نے ایک نہایت حساس اور سنگین مسئلے کو نہایت چابک دستی اور دانشمندی سے نمٹا دیا۔

ایم جی مہکری کی آخری دم تک خدمات

ایم جی مہکری نے اپنی پر بہار زندگی میں فراز ہی فراز دیکھا۔ترقیوں کے سفر میں کئی ہمالیائی بلندیوں کا سفر کیا۔نشیب ان کی زندگی کی راہوں میں بھٹک کر بھی نہ گزرا۔ان فراز میں وہ فراز بھی ہے جب وہ 1945ء میں ریزرو بینک آف انڈیا ممبئی

کے ڈپٹی گورنر کے باوقار منصب پر فائز ہوئے۔ یہ وہ منصب عالی ہے جس سے ہر کوئی سرفراز نہیں ہوتا۔ اس عہدہ پر 1945 تا 1950 فائز رہے۔ اس دوران ابتدائی تین ماہ کے اندر بینک املاک کا غائرانہ جائزہ لے کر بحسن وخوبی اپنی ذمہ داری نبھائی۔ یہ عہدہ انہوں نے اپنے قریبی ساتھی رامراؤ کے رائے مشورہ سے سنبھالا تھا جو کہ دہلی میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ ریزرو بینک کے ڈپٹی گورنر کی حیثیت سے نمایاں کارکردگی کے نتیجے میں ریزور بینک آف انڈیا آج بھی ادارے کے خصوصی شمارہ میں ان کی تصویر شائع کرتی ہے۔

قبل ازیں مہکری صاحب جموں وکشمیر کے دیوان بھی رہے جب میسور میں اڈمنسٹریٹر کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو کرن سنگھ نے مدعو کر کے دیوان کا باوقار عہدہ سپرد کیا۔ ڈپٹی گورنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تو کورگ جو میسور ریاست سے علیحدہ تھا، کے اڈمنسٹریٹر مقرر ہوئے۔ لیکن جب صحت نے ساتھ نہ دیا اور طبیعت دگرگوں ہوتی گئی تو ڈاکٹر نے آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے پیش نظر اس عہدہ سے مستعفی ہوگئے۔ ایم جی مہکری نہ صرف ایک قابل منتظم تھے بلکہ ایک عظیم انسان دوست ہستی تھے۔ سماجی کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

1965ء میں مہکری صاحب نے پیرانہ سالی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر 82 سال تھی اور وہ ممبئی میں تھے۔ میر نے خوب کہا ہے:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلوں یاں کہ بہت یاد رہو

☆☆☆

پیکر علم وعمل

حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ[19]

مہتمم دارالعلوم دیوبند

نہایت حلیم وبردبار، صائب الرائے، ذی شعور، صاحب فراست، دور اندیش، فرشتہ صفت، رئیس وامین اور حد درجہ خلیق ومتواضع، علم دوست اور پیکر عمل تقویٰ وطہارت میں ممتاز، بے انتہا مخلص، کامل زاہد کامل صوفی، امت کی اصلاح کیلئے ہمیشہ فکرمند، ان تمام صفات اور ان کے علاوہ دیگر بہت سی صفات کے حامل تھے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب۔

موصوف 1914ء، مطابق 1332ھ شہر بجنور کے ایک زمیندار علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت مولانا مشیت اللہ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے ممبر اور اپنے وقت کے علماء میں سے تھے، مولانا مشیت اللہ صاحب کو سید المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ سے حد درجہ کی عقیدت اور خصوصی تعلق تھا۔ علامہ کشمیری قدس سرہ مولانا مرحوم کے استاذ تھے لیکن دونوں میں تعلق دوستانہ تھا، سید المحدثین کئی

[19] خلیل الرحمٰن قاسمی برنی، راشٹریہ سہارا، 21 ستمبر-2010ء

مرتبہ چھٹیوں کے لمحات بجنور مولانا مشیت اللہ کے گھر گزارتے تھے۔ مہتمم صاحب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مرحوم کے اسلاف میں سے حضرت مولانا رحیم اللہ بجنوری بھی ہیں، جن کا اپنے وقت کے مایہ ناز اساطین علم میں شمار ہوتا تھا، اور حضرت نانوتوی قدس سرہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ حکیم صاحب بجنوری (اعلیٰ اللہ درجۃ فی الجنہ) کے تعلق سے تاریخ دارالعلوم دیوبند میں لکھا ہے۔

''حکیم رحم اللہ صاحب حضرت نانوتوی کے آخری دور کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ استاذ کے ساتھ والہانہ تعلق تھا، حضرت نانوتوی کی شان میں انہوں نے عربی میں کئی قصیدے لکھے ہیں.....صاحب نسبت اور پابند اوقات بزرگ تھے.....آگے لکھا ہے مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند جو بجنور کے قومی وملی رہنما ہیں اور بااثر شخصیت ہیں حکیم صاحب کے اخلاف میں سے ہیں''۔

مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کا زمانہ طالب علمی

مولانا مرغوب الرحمٰن نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جس میں علم وعمل کے چرچے تھے ابتدائی تعلیم شرح وقایہ تک اپنے شہر بجنور کے مدرسہ رحیمیہ میں حاصل کی، ذہانت، طباعی سلیقہ مندی، بڑوں کا احترام، طبیعت میں صلاح ونجابت بچپن ہی سے اللہ نے آپ کو ودیعت کی تھی۔ 1929ء مطابق 1347ھ میں آپ دارالعلوم میں داخل ہوئے، دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کا زمانہ چار سال رہا ہے، اس عرصہ میں علمی انہماک کے ساتھ، تقویٰ وطہارت پاکیزگی کردار، اساتذہ کی خدمت اوران کا مکمل احترام آپ کا خصوصی وصف رہا۔

آپ کے علمی انہماک اور زمانہ طالب علمی میں آپ کے صالح مزاج کو سمجھنے کے لئے یہ واقعہ ضرور مفید ہوگا جو آپ نے 2002ء میں دارالعلوم کی مسجد رشید میں طلبہ

کو نصیحت کرتے ہوئے بیان کیا تھا۔ آپ نے کہا: ''جب ہم دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے تو اس وقت ایک فلم آئی جس کا نام ''مغل اعظم'' تھا، بڑا چرچا تھا، اس فلم کا میرے قریب رہنے والے کئی طالب علم مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ چلو دیکھ کر آئیں گے، میں نے ان کو منع کر دیا، ایک دن وہ ساتھی دیکھنے کے پختہ ارادہ سے نکلے، تو میں نے ان کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی اور خوب سمجھایا فرمایا! میری کوشش کارگر ہوئی اور وہ ساتھی رک گئے۔ یہ واقعہ سنا کر انہوں نے طلبہ دارالعلوم کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ بھی صالح رہیں اور دوسروں کی اصلاح کی بھی ہمیشہ فکر رکھیں تو ہمیں صاف شفاف معاشرہ دیکھنے کو ملے گا۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کے دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی، حضرت مفتی شفیع دیوبندی ہیں، ان کے علاوہ بھی آپ نے دارالعلوم کے کئی اساتذہ سے اکتساب فیض کیا ہے۔ فراغت کے بعد کئی سال آپ علیل رہے اور علالت کا یہ زمانہ آپ نے گھر ہی پر گزارا، جوں ہی اللہ نے آپ کو صحت یاب کیا آپ کے علمی شوق اور ولولہ نے پھر انگڑائی لی اور دیوبند کیلئے آپ نے رخت سفر باندھا، دیوبند پہنچ کر آپ نے تکمیل افتا میں داخلہ لیا۔ فتویٰ نویسی کا نصاب مکمل کرنے کے بعد آپ حضرت مدنی قدس سرہ کے دست گرفتہ ہوگئے۔

فراغت کے بعد آپ اپنے وطن تشریف لے گئے اور وہاں قومی، ملی اور رفاہی خدمات میں مشغول ہوگئے۔ ضلع بجنور میں آپ ہر دلعزیز شخصیت کے حامل انسان تھے، اپنوں اور پرایوں کی ہمدردی ضرورت کے موقع پر ان کا تعاون، صدمات کے وقت ان کی دلجوئی ودلداری اس دوران آپ کا خصوصی مزاج تھا۔ دارالعلوم دیوبند سے آپ کی کئی پشتوں کا تعلق تھا۔ اس تعلق میں آپ نے اضافہ کیا اور اپنے بڑوں کی طرح آپ بھی دارالعلوم دیوبند کا ہر ممکن تعاون کرتے رہے۔

مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے

1962ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن منتخب ہوئے موصوف نے ان مجالس شوریٰ میں حاضری کی نہایت استقلال کے ساتھ پابندی کی۔ خداوند قدوس نے چونکہ آپ کو اصابت رائے اور صلابت رائے دونوں اوصاف سے خصوصیت کے ساتھ نوازا تھا اس لئے شوریٰ کے جلسوں میں آپ کی حاضری دارالعلوم دیوبند اور ارباب دارالعلوم دونوں کے حق میں مفید ونفع بخش رہی، اسی لئے اجلاس صد سالہ کے بعد دارالعلوم کے حالات میں جب ذرا تغیر آیا اور حکیم الاسلام حضرت قاری طیب صاحب قدس اللہ اسرارہ کو اپنے لئے ایک معاون کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے اپنا یہ تقاضہ شوریٰ کے سامنے رکھا۔

مددگار مہتمم مقرر ہوئے

مجلس شوریٰ نے ماہ رجب 1401ھ مطابق اگست 1981ء میں آپ کو مددگار مہتمم منتخب کیا۔ پھر جب نومبر 1981ء میں دارلعلوم کیمپ قائم ہوا تو اس دوران شوریٰ نے آپ کو دارالعلوم دیوبند کا مہتمم منتخب کیا اور وفات تک اسی منصب پر فائز رہے۔ آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم دیوبند نے نمایاں ترقی کی بالخصوص تعلیمی، تعمیری اور انتظامی لحاظ سے دارالعلوم کو موجودہ شاہراہ ترقی پر پہنچانے میں آپ کا خصوصی کردار ہے۔ اہتمام سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے آپ نے دارالعلوم کے تعلیمی امور پر توجہ دی، آپ کے دور اہتمام سے پہلے دارالعلوم میں ابتدائی اور درجات کا نظام درس وتدریس بہت اچھا نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے ابتدائی وانتہائی درجات کے نظام تعلیم کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کیا اور دونوں درجوں کی صحیح نگرانی کے

لئے دو دفتر تعلیمات قائم کئے، اسی کے ساتھ کئی تعلیمی شعبے جیسے تخصیص فی الحدیث، تخصیص فی الادب، تخصیص فی الافتاء، تکمیل العلوم، شیخ الہند اکیڈمی شعبہ تحفظ ختم نبوت، شعبہ رد عیسائیت، شعبہ محاضرات، شعبہ انگلش وغیرہ آپ ہی کے دور اہتمام میں قائم کئے گئے۔ مالی ترقی کے لحاظ سے آپ کے دور اہتمام میں دارالعلوم دیوبند کا یہ حال رہا کہ دارالعلوم دیوبند کا سالانہ بجٹ جو کہ آپ کے دور اہتمام سے پہلے ایک کروڑ تھا۔ آج کم وبیش پندرہ کروڑ سالانہ ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ وملازمین کی تنخواہوں اور طلبہ کے وظائف میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ آپ کے دور اہتمام میں تعمیری ترقی کا تناسب بھی حیرت انگیز رہا چنانچہ آسامی منزل، اعظمی منزل، مدرسہ ثانویہ کی بلند وبالا عمارت، رواق خالد قدیم وجدید، دارالقرآن، دفتر تعلیمات احاطہ مولسری کی چہار دیواری، دارالتربیت، تعمیری دنیا کی عظیم شاہکار جامع رشید اور دار جدید کی نئی تعمیر یہ سب تعمیرات آپ کے دور اہتمام میں وجود میں آئیں۔ فرق صالہ کی تردید وتعاقب میں بھی آپ نے کئی اہم پیش رفت کیں خصوصاً فتنۂ قادیانیت کا آپ کے زمانے میں بھرپور تعاقب کیا گیا اور اس کام کے لئے مبلغین ومناظرین کی تعداد میں اضافہ اور جابجا اس کی شاخیں قائم کی گئیں۔

دارالعلوم میں ۳۰ سالہ خدمات

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے منصب کا پورا پورا حق ادا کیا۔ فرائض میں کوتاہی کے جس طرح اپنے لئے روادار نہیں تھے دوسروں کے حق میں بھی آپ کی روش یہی تھی۔ جس ایثار، خلوص اور لگن کے ساتھ آپ نے مادر علمی کی خدمت کی ہے اس کی مثال مشکل ہے۔ کم وبیش 30 سال آپ نے دارالعلوم کی وقیع خدمات انجام دیں اور ان خدمات کے لئے اپنے آپ کو مکمل وقف کئے رکھا بلکہ کہنا چاہئے کہ

دارالعلوم دیوبند کے لئے اپنے آپ کو تج دیا، اس عرصہ میں آپ نے اپنی خدمت کا کسی بھی طرح کوئی معاوضہ نہیں لیا، علاوہ ازیں دارالعلوم دیوبند کے جس کمرے میں آپ کا قیام تھا اس کا کرایہ اور بجلی کا بل آپ اپنے جیب خاص سے ادا کرتے رہے۔ ایک اہم خصوصیت آپ کی یہ تھی کہ جس رائے کو آپ دارالعلوم کے حق میں مفید خیال کرتے اس پر پوری قوت کے ساتھ کاربند رہتے۔ 2002ء میں ایک خاص واقعہ کی بنیاد پر چند طلبہ کے اخراج پر بعض منتظمین مصر تھے۔ لیکن آپ کی رائے میں ان کا اخراج دارالعلوم کے اور ان طلبہ کے حق میں نہیں تھا اس لئے آپ طلبہ کے عدم اخراج پر اٹل رہے، آپ کا یہ فیصلہ بڑا مفید رہا۔

نماز باجماعت کے لئے پہلی صف میں

دارلعلوم کے سابق شیخ الحدیث اور قائم مقام مہتمم حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب جو اسی سال جوار رحمت میں پہنچے اور جو قریب قریب آپ کے ہم عمر تھے۔ موصوف کے ساتھ حضرت کی رفاقت کافی طویل رہی، حضرت مہتمم صاحب، حضرت خان صاحب مرحوم کی رائے کا بہت احترام کرتے تھے۔ سردی ہو یا گرمی یا برق وباراں مہتمم صاحب جماعت کی نماز میں صف اول میں حاضری کا خاص خیال رکھتے، آپ کی تقریر دھیان سے سننے کے بعد پوری طرح سمجھ میں آتی تھی لیکن سادہ الفاظ سادہ اسلوب میں بڑے موثر ہوتے، حضرت حکیم الاسلام قاری طیب صاحب قدس سرہ کے بعد جن انتظامی صلاحیتوں کے حامل انسان کی دارالعلوم کی ضرورت تھی اللہ نے آپ کی شکل میں دارالعلوم کو عطا کر دیا تھا۔

صاف ستھری اور اجلی پوشاک، دراز قد، بیضوی چہرہ، سفید دوپلی ٹوپی، ذمہ داری کے احساس کو بیان کرتی شکن دار پیشانی، وجیہ اور مرغوب کن شخصیت تھی

آپ کی آپ کے حلیہ کی نمایاں خصوصیت آپ کی خاموشی اور ذکر وفکر میں آپ کی مشغولی تھی، حلم ومتانت اور خلوص ووفا آپ کے چہرے سے جھلکتا، سابق امیر الہند حضرت مولانا سید اسعد مدنی کے وفات پاجانے کے بعد متفقہ طور پر آپ کو امیر الہند تسلیم کیا گیا، جس کے آپ بجا طور پر مستحق تھے، ایشیاء کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کے یہ عظیم منتظم اور جماعت دیوبند کے کامیاب قائد وسپہ سالار اپنی بے لوث خدمات کے انمٹ نقوش چھوڑ کر یکم محرم 1433ھ مطابق 8/دسمبر 2010ء بروز بدھ صبح ساڑھے دس بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

موصوف کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر کرنا بہت مشکل ہے، آپ کی وفات سے صرف دارالعلوم کا ہی نہیں بلکہ پوری امت کا نقصان ہوا ہے۔ پسماندگان میں ایک صاحبزادے مولانا انوار قاسمی دامت برکاتہم اور ایک صاحبزادی ہیں۔ مولانا انوار صاحب قاسمی ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں، حضرت مولانا سید اسعد مدنی قدس سرہ کی صاحبزادی سے نکاح مسعود ہوا۔ خدا پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور دارین کی کامیابی سے ہمکنار کرے، دارالعلوم دیوبند کو حضرت کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

☆☆☆

شیخ الحدیث مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ [20]

اوفوہ! کیسے کیسے لوگ اٹھتے چلے جارہے ہیں۔ان کے ساتھ میرا ایک سفر حج ہوا، وہ بہت سادہ طبع اور متواضع تھے، سفر حج کے موقع پر عام طور سے حضرت والا ٹھہرنے کی ترتیب میں مجھے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ الفاظ تھے دارالعلوم سبیل الرشاد کے شیخ الحدیث اور مہتمم امیر شریعت کرناٹک حضرت مولانا مفتی اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کے، جس وقت کہ احقر نے ان کو ۱۴ر فروری کی صبح بذریعہ فون حضرت شیخ الحدیث کے انتقال کی خبر دی.... وہ اوصاف نبوی کے حامل تھے، یہ عنوان تھا، مولانا ظفر ریاست علی بجنوری محدث دارالعلوم دیوبند کی اس تقریر کا جو انہوں نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سانحہ ارتحال کے موقع پر منعقد جلسۂ تعزیت میں اساتذہ طلبہ دارالعلوم کے سامنے گوش گزار کی.... حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب کا وجود عجائب قدرت میں سے ایک نادر عجوبہ اور کرشمہ خداوندی تھا، اس دور میں ایسے لوگ مفقود ہیں.... ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ حضرت مولانا یونس صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم وخلیفہ حضرت اقدس مولانا زکریا صاحب قدسرہ نے.... سادہ طبعی حد درجہ تواضع وکسر نفسی، حق گوئی وبے باکی، علم وعمل سے بھرپور ومعمور، عشق الٰہی

[20] خلیل الرحمٰن قاسمی برنی: سہارا بنگلور ۱۹ر فروری ۲۰۱۰ء ص:۶

ومحبت رسول ہمدردی محبت، خلق سے شفقت، اجلا کیریکٹر، صاف وشفاف کردار، تبحر علمی، معقولات میں درجۂ امامت، منقولات میں سمندر کی گہرائی، بے لوث، بے غرض، اللہ ہی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا، کامل خلوص واحسان، صدق وصفا، پاکیزگی اخلاق، مزکّی ومجلی قلب، کدورتوں سے صاف سینہ، جود وسخاوت، حلم وذکاوت قادر الکلامی وشستہ گوئی وقار ومتانت اور جلال وجمال کا حسین امتزاج جو دیکھے پکار اٹھے: **ما هذا بشر ان هذا الا ملک کریم** . ان تمام خوبیوں سے متصف تھے شیخ اول علامہ دوراں حضرت اقدس مولانا نصیر احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان حقائق کا اظہار کررہا ہے آج ہر وہ شخص جس نے آپ کے سامنے زانوائے تلمذ کیا، یا قریب سے آپ کو دیکھا..... بلاشبہ آپ سے پڑھنے والوں کی ایک خاص تعداد اللہ کو پیاری ہوگئی لیکن آپ کے تلامذہ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ جو چہار دانگ عالم میں علم وعمل کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں۔ حضرت شیخ اول کی رحلت کی خبر ان تمام فیض یافتگان پر صاعقۂ بجلی بن کر گری۔ سب رنجیدہ اور ملول ہیں، ہر ایک کو دکھ ہے، درد ہے، غم ہے، لیکن قدرت الٰہی کے سامنے سب بے بس وعاجز ہیں، کون نہیں جانتا کہ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے، وہ وقت مقررہ پر آتی ہے، اس وقت ایک منٹ کی بھی تقدیم وتاخیر ناممکن ہے۔ مضبوط قلعوں میں محفوظ رہ کر بھی موت سے نہیں بچا جاسکتا موت وہاں بھی آکر رہے گی.... نبی، ولی، محدث، صوفی، فقیہ، عالم، جاہل، امیر، فقیر، کالے گورے، مسلم، غیر مسلم ہر ایک کو موت آئی ہے اور ہر ایک کیلئے مقدر ہے..... لیکن موت، موت میں فرق ہوتا ہے۔ بہت سے حضرات کی موت ان کے لئے حیات جاودانی کا پیغام لاتی ہے۔ وہ اپنے کارناموں کی بدولت زندہ رہتے ہیں ان کی موت سے ایک عہد کا خاتمہ اور ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے..... وہ اپنے پیچھے ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں جن کو

اختیار کر کے ہزاروں لوگ منزل مقصود تک پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی زندگی کے ہر لمحہ کو تاریخ اپنے سینے میں جگہ دیتی ہے.... لاریب: شیخ اول نصیر احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ انہیں رجال کار میں سے تھے جن کے نقوش کی روشنی میں قیامت تک آنے والی نسلیں روشنی حاصل کرتی رہیں گی۔

شیخ نصیر احمد کا وطن مولود

مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۲۱ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ میں بلند شہر کے ایک گاؤں ''لبسی'' میں پیدا ہوئے۔ آپ کا گھرانہ خوش حال اور متمول تھا۔ آپ کے آباواجداد مغلوں کے دور میں کابل سے آئے اور ضلع بلند شہر میں دریائے گنگا کے کنارے بس گئے۔ ان سے وہاں بارہ بستیاں مختلف ناموں سے آباد ہوئیں۔ ان تمام بستیوں میں زیادہ تر انہیں مغلوں کے دور میں بسنے والے پٹھانوں کی اولاد ہے.... ان بستیوں میں سے ایک بستی کا نام ''لبسی'' ہے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا مقام پیدائش ہے۔ زمیندارانہ ٹھاٹھ باٹ اور رئیسانہ شان وشوکت پٹھان اپنی زندگی گزارنے کے عادی تھے..... خان صاحب شیخ اول رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا کہ زمینداری اور تمولی نے ہماری بستی والوں اور خاندان کے لوگوں کو عیش پسند بنادیا تھا۔ بے شمار افراد شراب وکباب کے عادی تھے۔ اور گھمنڈ تو گویا ان کی گھٹی میں رچ بس گیا تھا۔ آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ آئے دن جگہ جگہ مجرے منعقد ہوتے، گھروں میں ناچنے اور گانے والیاں بلائی جاتیں۔ رات میں کسی ضرورت سے گھر سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا تو کئی گھروں سے رقاصاؤں اور مغنیات کے گانے کی آوازیں مستقل کا معمول تھا۔ عیش ونشاط اور تاریکی کے اس ماحولوں میں کئی گھرانے دین کے روحانی وحیات بخش ماحول اپنائے ہوئے تھے اور دینی اصول وضوابط پر سختی سے کاربند تھے۔ جس کے نتیجہ میں اللہ نے

ان کو علم ویقین کی دوایسی شمعیں عطا کیں جن کی روشنی سے آج ان گنت افراد کے سینے نور نبوت اور علم وعرفان سے جگمگا رہے ہیں۔ شمع اول مہاجر مدنی حضرت مولانا عاشق الٰہی برنی اور شمع ثانی ہمارے ممدوح ومقصود حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ آپ کے بچپن کے ساتھی اور قریبی رشتے دار تھے۔ عمر میں آپ سے چھوٹے تھے۔ دونوں کی ابتدائی تعلیم ایک ساتھ ہوئی۔ دونوں ذہین، فطین، شوقین، لاابالی پن سے کوسوں دور، ہاں اتنا ضرور جیسا کہ عصر کے بعد کی مجلس میں حضرت نے خود سنایا کہ فارغ اوقات میں ہم دونوں بستی کے باہر دریا کے کنارے بیٹھ جاتے آموں کا ایک ڈھیر اپنے پاس رکھ لیتے کچھ کھاتے اور جو کھانے کے قابل نہ ہوتے ان کو دریا میں پھینکتے اور پانی کے ساتھ آموں کی دوڑ اور مسابقت سے لطف اندوز ہوتے۔ ہندوستان کا یہ تاریخی دریا جس کے کناروں سے تاریخ کی ان دو عظیم اور بے شمار افراد کی یادیں وابستہ ہیں دریائے گنگا کہلاتا ہے۔

تقسیم ہند کی داستان الم

جب تقسیم ہند کا روح فرسا اور دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آیا جس نے ہزاروں بستیوں کو اجاڑ دیا، لاکھوں قتل ہوئے، عزتیں اور عصمتیں لوٹی گئیں، گھر لٹ گئے، مسلمان پٹ گئے، بچے بھی سفاکیت کی نذر ہوئے، بوڑھے ناتواں، کمزور دہشت سے موت کے منہ میں گرے، جو باقی رہ گئے وہ بہت کمزور ضعیف اور ناتواں ومضمحل بن کر رہے۔ غرض ایک داستان الم ہے جو جگر کو پاش پاش کر دیتی ہے ایک تکلیف دہ حقیقی افسانہ ہے جو ہر جگر والے کے پتہ کو پانی اور خون کا پتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ تقسیم ہند کے اس واقعہ سے پٹھانوں کی یہ بارہ بستیاں بھی متاثر ہوئیں، یہاں بھی بہت سے گھرانے اجڑے کچھ قتل ہوئے اور کچھ پاکستان پہنچنے میں کامیاب

ہوگئے۔ خیر وعافیت سے پاکستان پہنچ جانے والوں میں ایک گھرانہ مولانا عاشق الٰہی بلند شہری کا بھی تھا۔ مولانا بذات خود کچھ عرصہ ہندوستان رہے پھر پاکستان ہجرت کر گئے، وہاں عالمی میدان میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، اللہ نے مولانا کی خدمات کو قبولیت سے نوازا اور ان کی تصانیف کو مقبولیت عامہ عطا کی۔ مزید فضل یہ کیا کہ ان کو دیار حبیب ﷺ میں رہ کر خدمات کا موقع فراہم کیا۔ مولانا نے اس حسین موقع کا خوب خوب فائدہ اٹھایا، بہت تھوڑے وقت میں بڑا علمی ذخیرہ امت کے حوالے کر گئے اور پھر رمضان ۱۴۲۲ھ کو علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔

تقسیم کے سال حضرت شیخ دارالعلوم میں تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے اور کمال یکسوئی اور پوری توجہ کے ساتھ اپنی علمی ضیاپاشیوں سے طلبہ دارالعلوم کے سینوں کو منور کررہے تھے، جب اساتذہ میں کمال اور وفور علم ہوا اور طلبہ میں طلب علم کا سچا جذبہ اور لگن اور گھلا دینے والا شوق تو پھر خدائے علیم وخبیر کے یہاں سے دولت علم کی برسات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اوائل تدریس سے سبکدوشی تک حضرت شیخ کی یہ خصوصیات رہی کہ آپ نے تدریس میں انتہائی محنت اور لگن سے کام لیا۔ آپ نے کوئی کتاب محض کتاب اور متعلقات کتاب دیکھ کر نہیں پڑھائی بلکہ ہر کتاب کو فن دیکھ کر پڑھایا۔ جس محنت سے آپ نے علم حاصل کیا اس سے کہیں زیادہ محنت آپ تدریس میں کرتے۔

شیخ کی اہم خصوصیت

حضرت شیخ کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ آپسی اختلافات کو بہت برا جانتے آپسی اختلافات سے آپ خود بھی پرہیز کرتے اور اپنے متعلقین کو بھی اس بری بلا سے بچنے کی تلقین فرماتے۔ یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے مشہور قضیۃ نامرضیہ

میں بھی آپ یکسور ہے اگر چہ دل کا میلان حضرت قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا۔ اسی کے ساتھ حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے احترام میں بھی کبھی کوتاہی نہیں کی۔ مولانا مدنی چونکہ حضرت شیخ کے استاذ زادہ تھے اس لئے ان کو ہمیشہ عزت احترام اور عظمت کی نگاہ سے دیکھا..... تدریس میں آپ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے اسلوب کے قائل تھے، مشکوٰۃ شریف میں مسائل، اختلاف ائمہ اور مختصر دلائل اس انداز سے بیان فرماتے کہ پورا درس طلبہ کے ذہن نشین ہوجاتا اور ترمذی شریف میں آپ مسائل اور اختلاف ائمہ کی وضاحت اور دلائل قدرے تفصیل سے بیان فرماتے اور پھر مسلک احناف کو اصول کی روشنی میں ترجیحی حیثیت سے واضح فرماتے۔

درس کے دوران ظریفانہ گفتگو

درس بخاری شریف میں مسائل اور اختلاف مسائل میں ضروری درجہ کی گفتگو فرماتے البتہ تراجم ابواب پر محققانہ گفتگو فرماتے۔ ترجمۃ الباب اور ذیل میں درج حدیث کے درمیان مطابقت جو کہ کئی جگہ کافی وقت اور نکتہ شناسی چاہتی ہے آپ کی پیش کردہ درسی توضیح سے بسہولت سمجھ میں آجاتی۔ دوران درس ظریفانہ گفتگو بھی فرماتے، اس قسم کی گفتگو اس وقت فرماتے جب سبق دیر تک جاری رہنے کی وجہ سے آپ طلبہ میں اکتاہٹ والی کمزوری محسوس فرماتے۔ ایک موقع پر آپ نے دوران درس بوجھ بجھکڑ والی کہانی سنائی جس سے طلبہ بہت محظوظ ہوئے۔ آپ نے فرمایا! ایک گاؤں میں ایک چودھری تھا جسے گاؤں والے بوجھ بجھکڑ کہتے۔ گاؤں والے اپنے فیصلے اس کے پاس لے جاتے، ایک دفعہ گاؤں سے رات میں ایک ہاتھی گزر گیا۔ صبح کو لوگوں نے پاؤں کے نشانات دیکھے، تو بہت گھبرائے یہ کون انسان ہے جس کے اتنے موٹے اور بڑے پاؤں ہیں یا کوئی جانور ہے، لوگ بوجھ بجھکڑ کو بلا کر لائے اس

نے بہت غور وخوض سے نشانات قدم کا معائنہ کیا اور کہا سمجھ میں آ گئی بات اس نے کہا یہ نشانات ہرن کے قدم کے ہیں اس کا پاؤں چکی کے پاٹ میں پھنس گیا وہ چکی کے پاٹ کو یونہی لے کر چلتا رہا اور رات میں یہاں سے گزرا۔ یہ کہہ کر وہ ہنسا پھر رویا، لوگوں نے دریافت کیا صاحب آپ پہلے ہنسے پھر روئے کیا وجہ ہے۔اس نے جواب دیا کہ اپنی سمجھ پر خوش ہوکر ہنسا کہ کیسی کیسی پیچیدہ باتیں میری سمجھ میں آجاتی ہیں اور رویا اس لئے کہ میرے مرنے کے بعد تمہیں ایسی سمجھ اور بوجھ کی باتیں کون بتائے گا۔

حضرت والا نے یہ کہہ کر فرمایا کہ بھائی میری مثال بوجھ بجھکڑ کی سی ہے۔اس واقعہ سے جہاں آپ کی زندہ دلی اور طبعی ظرافت کا پتہ لگتا ہے وہیں آپ کی کسر نفسی اور تواضع بھی خوب مترشح ہوتی ہے۔ پورے سال پابندی سے آپ کا سبق جاری رہتا، مشکل سے مشکل حالات میں بھی سبق کا ناغہ نہ کرتے، سبق کے ناغہ کی تعبیر آپ کے یہاں تعلیم کے خون سے تھی، روزانہ عصر کے بعد گھر پر عمومی مجلس ہوتی جس میں آپ کمال بشاشت سے شریک ہوتے۔ عام طور سے دوران مجلس چائے اور کبھی خاص مناسبت اور کبھی بلا مناسبت چائے کے ساتھ لوازمات بھی ہوتے، مجلس میں دارالعلوم کے کئی اساتذہ اور زیادہ تر طلبہ ہوتے، علمی سوالات، فنی موشگافیاں، اکابر کے حالات، امت کو درپیش مسائل اور تقاضے اس مجلس کا عنوان ہوتا، مجلس کے ہمیشہ کے حاضر باش، حضرت کے خاص پروردہ اور تربیت یافتہ حضرت قاری شفیق الرحمٰن صاحب استاذ قرأت دارالعلوم دیوبند اس مجلس میں حضرت کے ترجمان ہوتے، شیخ حضرت قاری صاحب سے بہت ہی مانوس اور بے تکلف تھے، قاری صاحب موصوف شیخ کو روز بروز لطائف سناتے جس سے حضرت اور پوری مجلس بہت محفوظ ہوتی.....تواضع اور کسر نفسی کی انتہا تو دیکھئے کہ ایشیا کی سب سے عظیم دینی درسگاہ کا یہ شیخ الحدیث اپنے مہمانوں کے لئے چائے فنجان میں خود اپنے ہاتھ سے نکالتا۔

قرآن کریم کے آپ عاشق تھے

طوالت مائل درمیانی قد، بیضوی چہرہ، کشادہ ابرو بڑی بڑی اور سرمگیں آنکھیں گورا سرخی مائل رنگ، سر اور داڑھی کے بال مکمل سفید، کھڑی ناک، کاغذی ہونٹ، آنکھیں بے عینک، سر پے دو پلی ٹوپی اور کبھی عمامہ، جو خوب جچتا، بلند اور کڑک آواز، تلفظ میں شفافیت، گفتگو میں سنجیدگی اور شستگی لمبے بازو اور گداز ونرم ہاتھ خدا کی قسم قدرت نے آپ کو بہت خوبصورت اور خوب سیرت بنایا تھا۔خوش اخلاقی میں آپ بے نظیر تھے۔ جو بھی آپ کو ایک دفعہ دیکھ لیتا کبھی نہ بھولتا۔صبر وشکر میں بھی آپ اکابر کے سچے پیروکار تھے، عین جوانی کے عالم میں آپ کی رفیقہ حیات آپ کو داغ مفارقت دے گئیں۔ مرحومہ کئی چھوٹے اور ننھے بچے چھوڑ کر گئیں، اس موقعہ پر جس صبر وضبط کا آپ نے مظاہرہ کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا، ان چھوٹے بچوں کی آپ نے اپنی علمی مصروفیات میں کمی لائے بغیر بہت اچھی تربیت کی۔تصنیف وتالیف کا آپ کو ذوق نہیں تھا، لیکن پھر بھی جو لکھا بہت اچھا لکھا، چغمینی فن ہیت کی مشہور کتاب ہے، حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر مفید حاشیہ تحریر فرمایا یہ حاشیہ عربی زبان میں ہے، اس حاشیہ نے اس کتاب سے استفادہ کو آسان بنادیا، چغمینی کے ساتھ یہ حاشیہ مطبوعہ ہے اور آج چونکہ یہ کتاب مدارس میں داخل نصاب نہیں رہی اس لئے نایاب ہے۔

قرآن پاک کے آپ عاشق تھے، فن قرأت میں آپ کو خصوصی ملکہ حاصل تھا، اور فن کے نشیب وفراز سے آپ اچھی طرح واقف تھے، حسن صورت کے ساتھ حسن صورت بہت بڑی نعمت ہے قدرت نے آپ کو ان دونوں نعمتوں کا جامع بنایا تھا، بہت عمدہ اور بلند آواز کے مالک تھے، ایک لمبے عرصہ تک تمل ناڈو کے مشہور شہر کوئمبتور میں قرآن عظیم کی تفسیر کے لئے آتے رہے، یہ سفر آپ کا ہر سال رمضان المبارک کے

مبارک مہینہ میں ہوتا اس لئے تفسیر کے ساتھ تراویح میں قرآن پاک سنانے کی ذمہ داری بھی آپ خود لیتے، جن حضرات نے آپ کے پیچھے تراویح پڑھی ہیں آج بھی وہ حضرات کی آواز کو یاد کر کے تڑپ جاتے ہیں۔ کم وبیش ۳۰ سال آپ نے رمضان المبارک کی خیر و برکت سے بھرپور ساعتیں کوئمبتور میں گزاری ہیں۔ اس شہر میں اللہ نے آپ سے بہت سا اصلاحی کام لیا ہے، یہاں آپ کی مساعی سے ایک مسجد بھی تعمیر ہوئی جو آج شہر کی مرکزی مسجد شمار ہوتی ہے۔

ختم بخاری کی یادگار مجالس

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار مجلسوں میں سے ختم بخاری کی مجلس بھی ہے، مجلس ہر سال ختم بخاری کے موقعہ پر منعقد ہوتی، اس مجلس کے موقعہ پر دارالعلوم کی رونق دوبالا ہو جاتی، قریبی گاؤں دیہات کے ہزاروں محبان دارالعلوم ومحبان شیخ دارالعلوم میں جمع ہو کر اس مبارک مجلس کی شرکت سے اپنا دامن سعادتوں اور برکتوں سے بھرتے۔

اس موقعہ پر حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ بخاری کی آخری حدیث:

"كَلِمَتَانِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْم"

پر بہت دلنشیں انداز سے کلام فرماتے تقریر کے بعد رقت آمیز دعا فرماتے یہ دعا بڑی طویل ہوتی جس میں مسلمانان عالم کے لئے اور خصوصاً دارالعلوم دیوبند کی حفاظت کے لئے انتہائی الحاح وگریہ کے ساتھ دعا فرماتے۔ دوران دعا طلبہ دورہ حدیث کا عظمت حدیث کی علامت درسگاہ دارالحدیث میں تڑپنا وبلبلانا، مادر علمی کی مفارقت کے صدمہ سے غم والم میں آہیں بھرنا۔ ایک عجیب منظر ہوتا، آہوں، سسکیوں، پرنم آنکھوں، دردبھری آوازوں پر یہ مجلس اختتام پذیر ہوتی۔

آہ آج وہ مجلس نہیں رہی اس مجلس کے صدر نشیں بھی نہ رہے۔ ۲۰۰۲ء ختم بخاری کی اس طرح کی آخری مجلس تھی اور ۱۴ر فروری شب ۲۰۱۰ء کو مجلس کے گل سرسبد اور جماعت دارالعلوم دیوبند کے سرخیل وصدر مالک حقیقی سے جا ملے۔

خدا رحمت کند این عاشقین پاک طینت را

☆☆☆

حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی صاحبؒ [۲۱]

نہ ہر کسی کے آنے پر عالمی جشن ہوتا ہے اور نہ ہی جانے پر عالمی سوگ ہوا کرتا ہے، ہاں کچھ انقلابی اور اجلہ شخصیات ہوتی ہیں کہ جن کی زندگی، دنیا کے لئے پیغام اور مقصد عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔ان کی مشغولیت، اور زندگی کی ہمہ ہمی اپنے لئے نہیں بلکہ دوسرے کے لئے ہوا کرتی ہے، ایسے روشن اور تابناک ستاروں سے تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں ان کی قربانیوں اور کارناموں سے دین وملت کو قوت اور شعور حاصل ہوتا ہے جو صدیوں تک باقی رہتا ہے۔حضرت قاضی مجاہدالاسلام قاسمی نوراللہ مرقدہ کا بھی انہی زندہ جاوید شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔جس طرح طریقت اور تصوف کے میدان میں قدوۃ السالکین حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے اور تحفظ شریعت اور بدعات اور رسومات کی بیخ کنی کے لئے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔اسی طرح حضرت قاضی صاحبؒ نے فقہی خدمات انجام دی ہیں کہ جس کی نظیر ماضی قریب اور مستقبل میں بھی شاید نہیں مل سکے گی۔قاضی صاحبؒ ایسے دردمند دل کے انسان تھے کہ امت کے لئے وہ ہر وقت تڑپتے تھے اسی درد اور کڑھن کو لے کر انہوں نے آل انڈیا ملی کونسل کی بنیاد ڈالی

[۲۱] ماخوذ: ماہنامہ ملی اتحاد، قاضی مجاہدالاسلام نمبر مضمون محمد ادریس حبان رحیمی

اور بلا لحاظ مسلک، مسلمانان ہند کو ایک پلیٹ فارم پر جوڑنے اور متحرک کرنے کے لئے خواہاں رہے اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اس میں کافی کامیابی بھی ملی۔اور ملت میں سیاسی شعور پیدا ہوا۔

اپنے اکابر سے خاص نسبت

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت تھانویؒ سے قاضی صاحبؒ کو ایک خاص نسبت حاصل ہے وہ یہ کہ ان دونوں بزرگوں کو اللہ تعالیٰ نے جسمانی اولاد کی تربیت اور پرورش کے جھمگھٹے سے دور رکھا اور روحانی اولاد بے شمار عطا فرمائی کہ ان کا سلسلہ تو انشاءاللہ قیامت تک چلے گا۔اسی طرح قاضی صاحبؒ بھی جسمانی اولاد سے تو محروم رہے لیکن الحمدللہ آپ کے شاگردوں کی تعداد اور آپ کا دینی وملی فیض کا سلسلہ بڑا طویل نظر آرہا ہے۔آپ نے اپنے پیچھے ایسی جماعت تیار کردی ہے جو آپ کے بقایا کاموں کو بحسن وخوبی پایہ تکمیل تک پہونچا سکتی ہے۔

حضرت قاضی صاحبؒ کا فقہی اور ملی خدمات کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ چند صفحات چند مضامین اس کا احاطہ نہیں کرسکتے۔بنگلور میں حضرت قاضی صاحبؒ کی مسلسل آمد رہی اور بہت سے پروگراموں پر وہ چھائے رہے اہالیان بنگلور کو جب بھی معلوم ہوتا کہ قاضی صاحبؒ کی آمد ہے تو سیل رواں کی طرح ابل پڑتے، خصوصاً سبیل الرشاد بنگلور سے آپ کا ربط اور تعلق گہرا تھا دارالقضاء بھی آپ ہی کی توجہات کا ثمرہ ہے جس سے ہزاروں مظلومین کو فریادرسی کا موقع ملتا ہے شریعت کے دارۂ میں ان سے انصاف کیا جاتا ہے، دوسری سب سے بڑی کوشش حضرت قاضی صاحبؒ نے فرمائی کہ آپ نے دارالقضاء کے لئے ''اسلامی عدالت'' نام کی معرکۃ الآرا کتاب بھی تصنیف فرمائی۔اور دارالقضاء اور اسلامی عدالتوں کو ایک خط امتیاز عطا

کیا۔ بندہ کو یوں تو حضرت قاضی صاحبؒ سے ملاقات کا متعدد بار شرف حاصل ہے۔ لیکن ۱۹۹۶ء میں ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کرنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

حضرت قاضی صاحبؒ کا وجود علماء کا وقار اور ہندوستان کا افتخار اور عالم انسانیت کا اعتبار تھا وہ اپنی سادگی میں بھی بلا کی جاذبیت رکھتے تھے۔ ان کے لہجے اور ان کے تکلم کی موسیقیت ان کے تبسم کی حلاوت اور خاندان کی علمی وجاہت اور مزاج کی بے نظیر شرافت، بے مثال تھی وہ ایک دردمند ایسے انسان تھے جو اس کرۂ خاکی پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت قاضی صاحبؒ آج ملت کے درمیان سے اٹھ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ لیکن ان کی خدمات ان کا متعین کردہ راستہ ہمارے سامنے ہے۔ اللہ تعالیٰ ملت اسلامیہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے۔

☆☆☆

پیکر علم وعمل

مولانا محمد حنیف صاحب سہارنپوریؒ [۲۲]

بہت سے طلباء کو دیکھا کہ وہ اساتذہ کرام میں خامیاں نکالتے رہتے ہیں۔ اور اپنی عقل وفہم کو درست سمجھتے ہیں ایسے طلباء دراصل شیطانی چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ ہمارے اکابر اور علماء کرام نے یہ درس دیا ہے کہ بڑوں کی غلطی نکالنا بھی غلطی ہے۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطاست

میں نے اپنے زمانہء طالب علمی میں کئی طلباء کو دیکھا کہ وہ اساتذہ کی غیبت کرتے اور ان کی عیب جوئی کرتے تھے اس کی نحوست ہے کہ وہ آج دنیوی لہو ولعب میں مشغول ہیں۔ صلاحیت ہے مگر بیکار اس کو کہتے ہیں پڑھا لکھا جاہل اس کے برخلاف ایسے طلباء بھی دیکھے ہیں جو بالکل کند ذہن اور غبی تھے لیکن اساتذہ کرام کی سختی برداشت کرتے رہے اور ادب واکرام سے علم حاصل کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان سے قرآن وحدیث کی مثالی خدمت لی اور وہ اپنے اساتذہ کرام کے جانشین اور نیک نامی کا سبب بنے۔

۲۲ ماخوذ انوار السالکین، مولف: محمد ادریس حبان رحیمی بنگلور

جامعہ خادم العلوم باغونوالی میں یہ ناکارہ داخل ہوا تو استادِ محترم مولانا منشی محمد عالم صاحب رحیمی مدظلہ نے (بندہ کے نسبتی برادر بھی ہیں اور استاد بھی، انکی فضیلت یہ کہ روزانہ ایک منزل قرآن مجید تلاوت کرتے ہیں اور ماشاء اللہ ۴۰ رسال سے تکبیر اولیٰ فوت نہیں ہوئی) فرمایا ادریس تم حضرت مہتمم صاحب کی خدمت کیا کرو۔ یعنی حضرت مولانا محمد حنیف صاحب مدظلہ العالی .....خادم العلوم میں رہتے ہوئے حضرت کیلئے چائے بنایا اور پان لگا کر دینا اور کمرے کی صفائی کرنا وضو کیلئے پانی دینا ناکارہ کی ذمہ داری میں شامل تھا.....اس فقیر نے حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کو نہایت قریب سے دیکھا مشفق، مہربان، متقی، پرہیزگار، نہایت صابر، معاملہ فہم، متحمل، دیانتدار، مخلص، مدبر، غرض حضرتِ والا جامع الصفات مہتمم، مقرر بے مثال، صلاحیت ایسی کہ بخاری شریف تک سب کچھ پڑھانے کا دیرینہ تجربہ اور استحقاق رکھتے ہیں۔ آج بھی پیرانہ سالی کے دور میں کئی کئی گھنٹے درسِ حدیث میں مشغول رہتے ہیں۔ پاؤں سے معذور ہیں۔ لیکن چہرۂ مبارک پر وہی نور، آواز میں وہی سوز وگداز.....ڈاکٹر آرام کا مشورہ دیتے ہیں لیکن حضرت فرماتے ہیں میرا آرام یہی ہے کہ میں آخر دم تک حدیث پڑھتا پڑھاتا رہوں۔ ادب واکرام اس فقیر نے حضرت مہتمم صاحب سے سیکھا ہے بڑے سے بڑے نازک موقع پر صبر وتحمل کے پیکر اور گفتگو پر مکمل گرفت حضرتِ والا کا خاصہ ہے۔ طلباء عزیز کو نصیحت فرماتے ہیں ایسے کہ بہت چھوٹے ہیں۔ صاف ستھری گفتگو شفقت اور ہمدردی سے لبریز نصیحتیں زندگی میں کام آنے والی باتیں ارشاد فرماتے ہیں۔ حضرت والا ۶۰ سال سے مسلسل خادم العلوم باغونوالی کے مہتمم اور ذمہ دار ہیں۔ مظفرنگر، سہارنپور، بجنور اور میرٹھ کے علاقہ میں یہ ادارہ اہم مقام رکھتا ہے۔ حضرتِ والا کا خلوص اور للّٰہیت اس ادارہ کی ترقی میں شامل ہے اللہ تعالیٰ حضرت مہتمم دامت برکاتہم کا سایہ امت پر تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین!

ضعف وعلالت کے باعث، حضرت مولانا محمد حامد حسین قاسمی کو نائب مہتمم بنایا گیا ہے تاکہ حضرت والا پر کام کا بار نہ ہو۔ ماشاء اللہ نہایت ذہین وفطین اور سلیقہ شعار اور علم دوست مزاج کے حامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی حفاظت فرمائے۔ اور امت کو ان کے فیوض وبرکات سے مستفیض فرمائے۔ آمین!

☆☆☆

تیری نیکیاں باقی تیری خوبیاں زندہ [۲۳]

نہیں معلوم یہ شہر خموشاں کیسی بستی ہے
زمیں آباد ہوجاتی ہے ویرانی نہیں جاتی

اس عالم فانی کا دستور ہے جو آتا ہے اسے بہر حال جانا ہے۔ انسانوں کی آمد ورفت سے اس جہاں میں نقوشِ زندگی کا اظہار ہے۔ ہماری اس دنیا کا رنگ محافل ہی نرالہ ہے، کہیں مسرت اور شادمانی کا ماحول ہے، تو کہیں رنج والم کا۔ کہیں صحت وتندرستی ہے تو کہیں بیماری اور علالت، کہیں تونگری ہے تو کہیں تنگ دستی۔ آدمی صبح میں خوش اور شادماں ہے تو شام میں فکر اور غم میں مبتلا ہے غرض ہمہ وقت زندگی کے لمحات تبدیل ہورہے ہیں۔ اور یوں سفر زندگی، آخرت کی طرف رواں دواں ہے۔ دنیا کے مختلف قافلے سمٹ کر شہر خموشاں کی جانب کوچ کررہے ہیں۔ جی ہاں شہر خموشاں میں بسنے والوں کی تعداد کبھی کم نہیں ہوتی ان کی تعداد میں اضافہ تا قیامت ہوتا رہے گا۔ مرحوم کے پاس وہی توشہ اور دفتر اعمال رہ جاتا ہے جو اس نے عالم کے لئے تیار کیا تھا۔ یہاں صرف احکم الحاکمین کی حاکمیت باقی رہ جاتی ہے۔ کسی کی سفارش قبول نہیں ہوتی۔ آنے والے کے دفتر اعمال کے موافق ہی اس عالم میں

۲۳ ماخوذ از: نقوش عالم خصوصی شمارہ، فروری، مارچ ۲۰۱۰ تحریر: محمد ادریس حبان رحیمی

سلوک کیا جاتا ہے۔ صرف ایک ہی راستہ اور ایک ہی واسطہ باقی رہتا ہے۔ وہ ہے فضل خداوندی، رحمت خداوندی۔ اس عالم میں تا قیامت قیام رہتا ہے۔ البتہ جانے والا اس جہانِ فانی میں کچھ فصل تیار کر کے چلا گیا تو یقیناً اس کا بدل اسے پہونچتا رہتا ہے۔ آنے والا دنیا والوں کو خوشی اور مسرت کے لمحات سے ہمکنار کرتا ہے اور جانے والا غمگین کر دیتا ہے۔

والدین کا رشتہ

محسن کائنات ﷺ سفر پر ہیں کہ راستہ میں آپ کے والدین مطہرین کی آرام گاہیں آتی ہیں۔ آپ ﷺ سواری سے اتر کر قبور کے پاس تشریف لے جاتے ہیں اور والدین کی محبت میں اس قدر گریہ فرماتے ہیں کہ آپ کے سسک کر رونے کی آواز صحابہ تک پہونچتی ہے۔ تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی رونے لگتے ہیں۔ سرکار دوعالم ﷺ واپس تشریف لاتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں مجھے اللہ تعالیٰ نے موقع عطا فرمایا تو میں والدین کی قبو پر گیا۔ اللہ اکبر، خاتم النبیین، شفیع المرسلین ﷺ بھی والدین کی محبت اور الفت میں گریہ فرماتے ہیں۔ کیوں کہ یہ فطرتِ انسانی اور صفتِ آدم ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے صاحبزادۂ مکرم حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ زمانۂ شیر خواری میں انتقال فرماتے ہیں تو حضور سرور کونین ﷺ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں۔ گویا والدین کے لئے اولاد اور اولاد والدین کے لئے آنسو بہاتے ہیں۔

شہنشاہ ہندوستان جلال الدین اکبر لال قلعہ میں دربار سجائے بیٹھا ہے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہے۔ کسی مقرب نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کو کسی چیز سے محروم نہیں رکھا۔ آپ کے اشاروں پر ہزاروں افراد حکم کی تعمیل کرنے والے ہیں۔ آپ شہنشاہِ وقت ہیں۔ بہادری اور شجاعت میں یکتائے روزگار ہیں۔ پھر کیوں

گریہ فرمارہے ہیں۔جلال الدین اکبرآنسو پوچھتے ہوئے کہتا ہے، ہاں ہاں بیشک۔ بادشاہ سلامت اور حضور کے لقب سے پکارنے والے بہت ہیں لیکن اکبر کہہ کر آواز دینے والی ماں آج دنیا میں نہیں رہی۔ میں یتیم ہوگیا ہوں، جس ہستی کی دعائیں میرے لئے عرش معلیٰ پر پہونچتی تھیں، آج وہ ہستی نہ رہی۔

راقم الحروف محمد ادریس حبان رحیمی کی والدہ ماجدہ نے میرے والد بزرگوار کے ساتھ زندگی کے اٹھاون سال گذارے۔زندگی کے نشیب وفراز میں والدِ محترم کی معاون اورغم گسار ہیں اور ہم نو بھائیوں اور دو بہنوں کی پرورش، تعلیم وتربیت کے لئے اپنی متاعِ زیست کو وقف کردیا تھا۔سب کی ازدواجی زندگی سے مطمئن تھیں۔ ڈھیڑوں دعائیں دیتی رہتی تھیں۔اپنے بھرے پرے خاندان میں کبھی کسی طرف سے لاپرواہ نہ رہتیں۔آنے والے مہمانوں کے ساتھ حسن سلوک اور جس قدر ممکن ہوا وقت پر تواضع مدارات ان کی فطرت تھی۔ دور دور سے عورتیں ملاقات کیلئے آتیں۔ جن میں ضرورت مند خواتین بھی ہوا کرتی تھیں۔ان کی مدد اس طرح کیا کرتیں کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔اگر کبھی کسی نے معلوم بھی کرلیا تو کہہ دیا اللہ نے دیا میری کیا حیثیت ہے۔

اولاد کو ہمیشہ نصیحت فرماتی رہتیں اور حلال وحرام کا حد درجہ اہتمام رکھتیں۔ ناجائز آمدنی اور ناجائز کاموں سے سختی کے ساتھ تنبیہ فرماتیں۔اپنی گفتگو میں تھوڑی دیر دنیاوی رسوم ورواج کی باتیں بھی کرلیتیں لیکن جیسے ہی موقع ملتا۔وقت ضائع کئے بغیر تسبیحات میں مصروف ہوجاتیں۔جمعہ کے دن نوافل کا اہتمام رہتا۔اور جمعہ کی نماز کے لئے گھر کے ہر فرد کو جلدی تیار ہوکر مسجد جانے کی تلقین فرماتیں اور رمضان المبارک میں تو گویا دن رات عبادت ہی کے لئے وقف ہوا کرتا تھا۔سال کی متبرک راتوں میں 'شب گذاری' معمول تھا۔ بیٹیوں سے محبت تھی تو بیٹوں سے بھی الفت

تھی۔ ہر ناخوش گوار موقع پر صلہ رحمی کو مقدم رکھا کرتی تھیں۔آٹھ سال قبل آپریشن کے بعد آنکھوں کی بینائی سے محروم ہوگئیں تھیں۔تو میں نے ازراہ تسلی کہا۔اماں اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلہ میں جنت کی بشارت دی ہے۔تو ایک آہ بھر کر کہا۔ بیٹا تو صحیح کہتا ہے۔لیکن مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ نابینا ہونے کی وجہ سے پاکی اور صفائی قابل اطمینان نہیں رہتی۔ باقی الحمدللہ رضاءالٰہی کے طابع ہوں، دوسروں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔وضو میں آخر تک مسواک کا اہتمام رہا۔

مجھے اپنی والدہ کی ایک ایک بات یاد آرہی ہے۔لکھنے کو ایک دفتر چاہئے۔ان کی آغوش میں ہم لوگوں نے پرورش پائی انہوں نے ہمارے غم، ہماری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھا۔ چند دنوں سے تو ایسا تھا کہ بار بار سب کی خیریت دریافت کرتی رہتی تھیں۔اور بار بار سب کے پاس چلی جاتی تھیں۔ ایسا لگتا جیسے یہ کسی خاص سفر پر روانہ ہونے والی ہوں۔اور آخرت کا استحضار اور موت کی یاد تو ہر وقت رہتیں، یہ بھی کرلو، وہ بھی کرلو، نہیں معلوم میری زندگی کتنی باقی ہے۔آخر وہ گھڑی آپہونچی کہ جمعہ کے دن مغرب کی نماز ادا کی (۱۵رجنوری ۲۰۱۰ء) کھانے سے فراغت حاصل کی۔ عشاء کی نماز کے لئے (وقت سے بہت پہلے) وضو کی نیت سے اٹھیں۔ چکر آیا برادرِ عزیز ڈاکٹر عمار حسین آگئے انہوں نے انجکشن دیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیام آگیا اور روح پرواز کرگئی۔زندگی اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اس نے اپنی امانت واپس لے لی۔ ہمارے پاس صبر اور دعاؤں کے سواء ہے بھی کیا؟

تمام برادران اور اہل خانہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت اماں جان مرحومہ کی بشری لغزشوں کو عفو ودرگذر فرما کر ان کے درجات کو بلند فرمائے۔آمین!

اللھم اغفرلہ وارحمہ واعفہ واعف عنہ واکرم
نزلہ ووسع مدخلہ . آمین!

جن کی یادیں مجبور کرتی ہیں رونے پر
جن کی جدائی سے روح اداس اداس ہے

مرکزِ محبت منبعِ شفقت دادی اماں [۲۴]

میری والدہ محترمہ اور حضرت والد صاحب قبلہ مولانا حکیم محمد ادریس حبان صاحب فہوضہم فرماتے ہیں کہ تم بڑے خوش نصیب ہو تم نے اپنے خاندان کے پورے بزرگوں کو دیکھا دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، چچی، پھوپھا، پھوپھی، ماموں ممانی وغیرہ اور حقیقت بھی ہے کہ آج تک ہمیں خاندان میں کسی فرد کی کمی احساس نہیں ہوا، جب بھی ہم کسی سے سنتے کہ اگر میرا فلاں ہوتا تو ایسا ہوتا، یہ جملہ ہمیں عجیب سا لگتا کہ یہ صاحب بھی کیا ہیں جوانی کے عالم میں دادی کو یاد کر رہے ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے اور آج اس کو میرے جسم کا رواں رواں محسوس کر رہا ہے اس احساس کو نا تو میری زبان بیان کر سکتی نہ قلم اس کو کوئی شکل دے سکتا۔ کہنے کو ایک چھوٹا لفظ دادی اماں جو ہم سے ۲۷ سو کلومیٹر دور رہتی تھیں۔ آج میں پورے اعتماد کے ساتھ لکھ رہا ہوں ہمارے دل دادی اماں کی اللہ کے حضور کے حاضری کو محسوس کر رہے ہیں اور اس وقت احساس ہو رہا ہے ہماری دادی ہم سے دور ضرور تھیں مگر ان کے دل سے ہمارے سانسوں کے تار جڑے ہوتے تھے جو آج ہم سے ٹوٹ گئے۔ ۱۳ اور ۱۴ رجنوری کی دونوں راتیں والد محترم نہیں سو پائے۔ پوری رات ٹہل کر گزار دیں، طبیعت بے حد تھکی تھکی، طبیعت معلوم کی فرمانے لگے طبیعت تو ٹھیک ہے مگر کوئی چیز اچھی نہیں لگ رہی ہے کسی کام میں دل نہیں ہے، والد محترم کا معمول ہے کہ گھر میں اگر ان کو دس منٹ بھی فرصت کے لئے ملتے ہیں تو اپنی الماری سے مسودات نکال کر تصنیف و تالیف میں منہمک ہو جاتے ہیں اور ایسے منہمک رہتے ہیں کہ گھر کے بچوں کا شور و شغب بھی آپ کو پریشان نہیں کر پاتا

۲۴ ماخوذ از: نقوش عالم خصوصی شمارہ، فروری، مارچ ۲۰۱۰ء، تحریر محمد فاروق اعظم حبان قاسمی

لیکن آج آپ معمولات کے خلاف خاموش یکسو ہو کر پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ سبھی بھائی بہن ارد گرد بیٹھے محو گفتگو تھے، والدہ ماجدہ اور والد محترم دونوں دادی اماں کی قصیدہ خوانی میں مصروف تھے۔ والدہ محترمہ نے تبسم کرتے ہوئے کہا آج تمہارے ابو کو اماں یاد آ رہی ہیں والدہ کے اس جملہ پر والد محترم نے بھی تبسم فرمایا اور کہنے لگے حقیقت ہے آج تو اماں یاد آ رہی ہیں۔ ادھر باتیں ہو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی میں نے فون ریسو کیا دوسری طرف چچا محمد طاہر انصاری تھے، آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی کہنے لگے ابھی ابھی پانچ منٹ قبل اماں کا انتقال ہو گیا ہے۔

انتقال کی اطلاع کسی بجلی کی طرح دل و دماغ پر گری زبان گنگ ہو گئی۔ گھر میں والد محترم والدہ محترمہ جو ابھی ابھی دادی اماں کے قصیدہ گنگنا رہے تھے، ان کو میں کیسے یہ اندوہناک خبر دوں۔ ہمت کی مگر زبان لڑکھڑانے لگی۔

والد محترم نے معلوم کیا کہ کس کا فون تھا۔ جس پر میری زبان خاموش رہی میں نے والدہ کو تتلاتی زبان سے اطلاع دی کہ چچا کا فون آیا ہے کہ دادی اماں کی طبیعت بہت خراب ہے ابھی بلایا ہے میرا جملہ ابھی پورا بھی ہوا نہیں تھا کہ والدہ محترمہ کسی مورتی کی طرح مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔ آنکھیں اپنی جگہ منجمد والد صاحب جو ابھی ابھی دادی اماں کے قصے سنا رہے تھے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے والد صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ بارگاہِ ایزدی میں دراز کر دئے اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ والد صاحب کو یہ اطلاع دینے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آج ہماری دادی اماں دنیا کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئی ہیں۔ والد اور والدہ صاحبہ نے برادر خورد حکیم محمد عدنان حبان کو آواز لگائی بیٹا! گاڑی نکالو! ائیر پورٹ چلو۔ سارے گھر میں خاموشی ہی خاموشی تھی گویا سب کی آوازیں گم تھیں آنکھیں نمناک ہر ایک زبان پر بس ایک ہی لفظ تھا اللہ خیر کرے۔

ہمارے عزیز محترم نعمت اللہ حمیدی صاحب چیف رپورٹر روزنامہ سہارا بنگلور کو اطلاع دی اور ایر ٹکٹ کے لئے بک کرنے کی گزارش بھی کی وہ اپنی ساری مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہمارے ٹکٹ کے بندوبست میں لگ گئے ،آپ نے واپس فون کیا اور بتلایا کہ آج اتفاقاً بنگلور سے ۸:۵۵ کے بعد کوئی بھی دہلی کے لئے فلائٹ نہیں۔آپ صبح ہی جاسکتے ہیں اس درمیان حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب قاسمی دامت برکاتہم اور الحاج سید ریاض احمد صاحب لوگ آ یکتا، سے بھی رابطہ کیا آپ نے بھی فلائٹ کے اوقات کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

آپ کی اطلاع بھی حمیدی صاحب کے مطابق ہی تھیں۔والد صاحب پر سکتے کا عالم تھا اور والدہ محترمہ کے آنسو تھمنے کا نام نہ لے رہے تھے، رات ۹ بجے جناب حمیدی صاحب کی جانب سے پی این آر نمبر کا میسج ملا۔رات کے ۹:۳۰ بج چکے تھے آج کا ایک ایک پل ہمیں سالوں کی طرح لگ رہا تھا۔والد صاحب قرآن مجید کی تلاوت سے فارغ ہوئے اور والدہ سے کہا کہ اماں کا انتقال ہوگیا ہے۔والدہ کی اس خبر کو سننے کے بعد حالت متغیر ہوگئی۔فرمایا آج حافظ عبدالباری نے خواب بیان کیا تھا جس کو میں نے نذر انداز کردیا تھا لیکن خواب سننے کے بعد طبیعت میں بے چینی بڑھ گئی تھی۔ اور اب اس کی تعبیر بھی پوری ہوگئی۔

دیر رات گئے گھر میں تلاوت وظائف کا سلسلہ جاری رہا رات کے ۳ر بجے بنگلور ایئر پورٹ کیلئے نکلے ایک جہاز میں ایک ساتھ ٹکٹ بھی نامل سکے، احقر الگ اور والد صاحب والدہ صاحبہ الگ فلائٹ سے ایک ہی وقت میں تمام اہل خانہ دہلی ایئر پورٹ پہونچے اور ایر پورٹ سے پورا قافلہ جس میں مولانا حکیم محمد عثمان قاسمی ڈاکٹر محمد سفیان بھی عزیزم مولانا محمد عثمان حبان دلدار اور دونوں بہنیں ڈاکٹر قرۃ العین عرف فاطمہ عثمان اور ڈاکٹر امۃ البریرہ فہمیدہ سفیان تمام کے تمام ایک ساتھ چرتھاول کے

لئے نکلے ٹھنڈ کا موسم اور سیٹ لہر چل رہی تھی پورے ماحول کو کہرے کی چادر نے اپنے لپیٹ میں لے رکھا تھا مستقل چرتھاول سے چچا اور دیگر رشتہ داروں سے مستقل رابطہ تھا، بارہ بج کر پچاس منٹ ۱۲:۵۰ پر مظفر نگر شاہ راہ مسجد اولیاء پر گاڑی روکی اور سبھی نے وضو کیا ۱:۱۵ پر چرتھاول پہونچے سلیمان منزل کے چاروں جانب اور مسجد عثمان غنی کا اندرونی و بیرونی حصہ مہمانوں سے کھچا کچھ بھرا ہوا تھا، گاڑی سے اتر کر گھر کی طرف چلے تو سارے لوگوں کی نظریں والد محترم کی آمد پر لگی ہوئی تھیں۔

آج ہمارے لئے وہ گلی وہ رشتہ دار جن کی خوشبو وطن سے دور ہر وقت ہم اپنے قریب محسوس کرتے ہیں۔جب پہونچے صرف دادی اماں کے رخصت ہوجانے سے خالی نظر آرہے تھے۔ وہی در ودیوار وہی ماحول اور در ودیوار زبانِ حال سے آج تیرے دل کی آوز کو سننے اور آرزو کو پوری کرنے دکھ کو بانٹنے اور ہر وقت یاد کرنے والی نہ رہی۔ ہاء اللہ جس دروازے پر پہونچ کر بچپن سے آج تک ہنسی رکتی نہ تھی ہر جانب دادی اماں کی چہل پہل اپنے نازک ہاتھوں کو بار بار ہمارے سروں پر پھیرنا کمر کو تھپ تھپانا ، پل پل حارث حارث! کی آواز آج وہ ساکت ہوگئیں تھیں۔سارے چچا جو دادی اماں کے ارد گرد ہمیشہ منڈلاتے رہتے تھے اور دادی جان مسکرا مسکرا کر ہدایات دیتی رہتی تھیں، جن کا نورانی گلابی چہرہ سفید چاندی جیسے بال دراز قد اونچی ناک اس پر نازک سا چشمہ پھر منہ میں پان اور ہلکی ہلکی مسکراہٹ اور کھنکتی ہوئی بہت ہلکی ہنسیں جو ہمارے سفر کی ساری تھکان دور کردیتی تھیں آج اپنے معبود حقیقی رب ذوالجلال کے دربار میں حاضر ہوچکی تھیں۔ان کی چاہنے والی خواتین کا ایک اژدھام تھا، قبلہ کی جانب چہرہ تھا، چہرہ دمک رہا تھا۔اللہ اللہ کیا خوش نصیب تھیں جنہوں نے دنیا ہی میں اپنی آخرت کی پوری تیاری کرلی تھیں والد محترم نو بھائی اور دو بہنیں ہیں، الحمدللہ تمام کے تمام اس وقت موجود تھے۔

دادے ابا صبر اوستقلال کا پہاڑ جن کی عمر اسّی کی دھائی کے اوپر ہے تمام کو دلاسہ دیتے اور ملاقات کرتے نظر آئے۔

نماز ظہر کا وقت قریب تھا مسجد عثمان غنی (جو ابھی حال ہی میں حضرت دادے ابا کی زیرنگرانی تعمیر ہوئی ہے) آج اپنی تمام وسعتوں کے باوجود چھوٹی نظر آرہی تھی، اندرونی حصہ برآمدہ اور صحن نمازیوں سے بھرا ہوا تھا، امام صاحب نے احکام میت ارشاد فرمائے اور نماز ظہر ادا کرائی نماز کے بعد حضرت والد محترم نے نماز جنازہ پڑھائی۔

نمناک آنکھوں سے جنازہ اٹھا اور کچھ ہی دیر میں چرتھاول کے مین روڈ سے گزرتے ہوئے قبرستان پہونچا، جہاں پر پہلے ہی ایک جم غفیر تھا۔ لحد تیار تھی لحد پر چادر تان دی گئی اور دادی مرحومہ کو ان کی آرام گاہ میں لٹا دیا گیا۔ لحد دیکھنے پر احساس ہورہا تھا کہ قبر نہیں بلکہ کسی کا بڑا ہی کشادہ صاف شفاف مکان ہے، لحد کو تختوں سے ڈھانپ دیا گیا، ہر طرف سے دادا جان نگرانی فرمارہے تھے۔ علمائے کرام حفاظ اور عمائدین کی ایک بڑی جماعت موجود تھی، تدفین سے فارغ ہوئے اور سارے حاضرین نے ایصال وثواب کیا۔

تدفین کے بعد واپس گھر پہونچے سارے چچا اور برادر مہمانوں کو کھانا کھلانے میں مصروف تھے۔ خاندان کے تمام افراد موجود تھے مگر آج والد محترم کو نام لے کر پکارنے والی موجود نہ تھی، آج گھر میں بیٹھے ہوئے دادی کا مفہوم ہمارے سمجھ میں آرہا تھا۔

چراغ لاکھ ہیں مگر ان کے اٹھتے ہی
برائے نام بھی محفل میں روشنی نہ رہی

☆☆☆

ولیٔ کامل منشی محمد شفیع بہادر پوری رحمۃ اللہ علیہ [۲۴]

۱۹۷۱ء کی بات ہے کہ خادم العلوم باغونوالی کے باہر چھوٹا سا راج بہار (نہر) کی پٹری پر عصر کے بعد ہم بہت سے طلباء چہل قدمی کررہے تھے۔ اچانک سامنے ایک سفید ریش بزرگ نمودار ہوئے اور برجستہ سلام کیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا کہ میں کیسا غافل رہا اور بزرگ نے سلام بھی کرلیا۔ اور خیریت بھی پوچھ لی وطن، حسب ونسب، گھریلو حالات، اتنے سارے سوالات کے جوابات میرے لئے کم ازکم ایک اجنبی مگر مشفق بزرگ کو دینا ذرا مشکل ہی ہوا۔ سیدھا سادا لباس سر پر رومال، گفتگو میں بلا کی جاذبیت، کسی نے کیا خوب کہا ؎

نظر برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی مگر دیکھنے کی تاب نہیں

بعد میں معلوم ہوا کہ میرے استاذ محترم مولانا محمد عالم صاحب مدظلہ العالی کے والد محترم تھے۔ تعطیل میں والدین کی زیارت وملاقات کے لئے چرتھاول جانا ہوا تو والدہ صاحبہ نے فرمایا۔ بیٹے رشتے تو بہت سے ہیں لیکن یہ ایک رشتہ اس لئے بھی مبارک ہے کہ آپ کے استاد محترم کی طرف سے ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ

۲۴ ماخوذ از: ماہنامہ نقوش عالم، اپریل ۲۰۰۴ء، تحریر: محمد ادریس حیان رحیمی

کے استاد اپنی ہمشیرہ سے رشتہ چاہتے ہیں، رائے کیا ہے آپ کی؟ میری رائے کیا آپ جو بہتر جانیں.....سوکریں..... میں نے جواب دیا، اور یوں ایک سادی سی تقریب میں طرفین میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ۱۰ مئی ۱۹۷۳ء کو چرتھاول سے جانسٹھ صرف سات نفر کے ساتھ یہ خاکسار محمد ادریس حبان بغیر سہرا، بغیر ہار سادہ سا دولہا، سادی سی تقریب میں شریک ہوا۔ حضرت مولانا مستفیض الرحمٰن بنگالی رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح خوانی فرمائی اور بعد نماز ظہر چرتھاول مع دولہن واپس آ گئے۔ شادیاں تو سبھی کی ہوتی ہیں لیکن اس تقریب کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں میرے والد محترم الحاج منشی محمد عمران صاحب مدظلہ العالی بوقت نکاح جانسٹھ موجود نہیں تھے، والد صاحب نے فرمایا، میرے بڑے بھائی رفیق احمد صاحب ساتھ ہیں تو میری ضرورت نہیں، نکاح ہے.....فارغ ہو کر آ جاؤ۔

اور دوسرے دن ہمارے اپنے گھر پر ولیمہ کی شاندار تقریب رہی جس میں دو ہزار سے زائد رشتہ دار دوست احباب شریک ضیافت رہے۔ میرے اپنے اساتذہ، دوست احباب سبھی اس بات سے خوش نظر آئے کہ اتنی سادگی سے شادی ہوئی، واقعی قابل تقلید ہے۔ جس کی مجھے بھی از حد خوشی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ میری شادی کے بعد میرے آٹھ بھائیوں اور دو بہنوں کی شادی اتنی سادگی سے نہیں ہو سکی۔ لیکن اس سادی سی تقریب کی برکتیں ابھی تک ہم محسوس کرتے ہیں۔

شادی کے بعد مکروہات زندگی نے اپنا رنگ دکھایا اور ہم بھی اس میں جکڑ گئے۔ اور پھر مدرسہ سے فراغت کے بعد کچھ احباب کے اصرار پر بنگلور آ گئے اور محترمہ اہلیہ صاحبہ، ''شاہ جہاں سیما'' کو بھی ہم اپنے والدین سے اجازت لے کر ساتھ لے آئے۔ یہ ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔ یا تو کبھی بازار سے کوتھمیر بھی خرید کر نہیں لائے تھے۔ اور یہاں سب کچھ ہم ہی خرید کر لا رہے ہیں۔

ہماری ذات سے متعلق ہماری عقلمندی پر ایک لطیفہ بھی پڑھ لیجئے کہ پہلی بار ہماری رفیقہ حیات نے ہم سے کہا کہ بازار سے ایک ماہ کا راشن اور ضروریات کا سامان لے آؤ۔ ہم نے اپنی جیب دیکھی تو اس میں تین سو روپئے نظر آئے۔ آج سے ستائس سال پہلے ۳۰۰ روپئے ایک اچھی رقم ہوا کرتی تھی۔ ہم محترمہ کے فرمان کے مطابق بازار گئے۔ اور جملہ تین سو روپئے کا سامان خرید کر گھر میں لے آئے اور دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ چلو اب ہم کو بھی ازدواجی زندگی کا سلیقہ آ گیا۔ بیگم کے سامنے سارا سودا سلف رکھ دیا۔ اور بتایا کہ ہم سب روپیوں کا خرید کر لے آئے۔ تو ہماری بیگم نے متفکرانہ انداز میں ہمیں دیکھا اور گویا ہوئیں.....ایں یہ کیا کیا آپ نے؟ اب مہینے بھر کے لئے روزانہ دودھ، گوشت ترکاری فروٹ، اور ضرورت پر دوائیں کہاں سے آئیں گی؟ ہم نے یہ سنا تو ہمارا سلیقہ ہوا ہو گیا۔

بہر حال یہ تمہید تھی ہماری ابتدائی ازدواجی زندگی کے لمحات کی۔ جس طرح ہم نے اپنے پدر محترم کو اپنے لئے ہمیشہ مشفق اور مہربان پایا۔ اسی طرح ہم نے اپنے خسر بزرگوار کو بھی مہربان پایا۔ خادم العلوم باغونوالی کی نہر پر ملنے والے بزرگ ہمارے خسر صاحب تھے جو شادی کے بعد ہمارے لئے ہر موقع پر پھل دار شجر ثابت ہوئے۔ اس بزرگ شجر کے سائے میں ہم نے زندگی کے بیش قیمت تجربات کئے اور اچھے برے کا سلیقہ سیکھا۔ ہمارے خسر صاحب کا نام منشی محمد شفیع ابن چھجو خان صاحب تھا۔ آپ ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، دینداری آپ کی گھٹی میں پڑی تھی بچپن میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لیکن والد کی شفقت سے پروان چڑھے۔ اپنے زمانہ میں اسکول کی پانچویں کلاس تک تعلیم حاصل کی۔ اس زمانے میں اتنی تعلیم اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی ہوا کرتی تھی۔ اسی لئے ہمارے خسر صاحب کا نام ''منشی'' ہو گیا۔ مدرسہ اور اسکول کی تعلیم کے بعد اپنے والد مرحوم کے ساتھ کاشتکاری میں لگ گئے۔ لیکن جلد ہی

وہ اپنے مزاج کے مطابق تعلیم وتعلم میں مشغول ہوگئے۔ کوال میں حضرت مولانا زرغام الدین صاحب کے پاس آنا جانا رہتا تھا۔ اکابر دیوبند سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ مدارس کے اجلاس اور تبلیغی اجتماعات میں کثرت سے شریک ہوتے۔ اور جب تک صحت رہی جماعت میں بھی وقت لگاتے رہے۔ آپ کی خوش مزاجی اور ملنساری کا یہ عالم تھا کہ مسلمان ہندو، سکھ، سب آپ کا اکرام کرتے تھے اور بازار سے نکل گئے تو چاروں طرف سے السلام علیکم آداب نمستے، کی آواز گونج جاتی تھی۔ پچاس سال کے طویل عرصہ میں بہت سے مدارس، مکاتب میں تدریسی خدمات انجام دیں اور آخر کے بیس سال مسجد کی امامت میں گذر گئے تدریسی لائن میں آپ نے ایک طویل خدمت انجام دی، غیر مسلم لوگوں میں بھی آپ کے بہت سے شاگرد رہے ہیں، حتی کہ آپ نے شیعہ حضرات کو اپنی تعلیمی خدمات سے محروم نہیں رکھا۔ یہی وجہ یہ کہ جانسٹھ کے سادات خاندان اور شیعہ حضرات میں بہت سے ممتاز لوگ آپ کے شاگرد ہیں علماء کرام کی ایک بڑی تعداد کو بھی آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

آپ کی زندگی کا ایک بڑا سانحہ اس وقت پیش آیا۔ جب آپ کے بھائیوں نے دھوکہ سے آپ سے کاشت کی زمین اپنے نام لکھوالی۔ اور کھلا دھوکہ دیا چاہتے تو مقدمہ لڑکر زمین واپس حاصل کر سکتے تھے لیکن اللہ نے آپ کو دل نہیں کوہ استقامت عطا فرمایا تھا۔ زمین حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی ایک ایک روپئے پر دنیا کے لوگ جان دیتے ہیں لیکن منشی جی نے کروڑوں روپئے کی زمین اور اس سے بننے والا خوش حال مستقبل ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ اور بڑی تندہی کے ساتھ تعلیم وتعلم میں لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے حسن نیت کے طفیل آپ چاروں صاحبزادوں کو علم دین کی دولت سے مالا مال فرمادیا۔ مولانا محمد عالم صاحب، آپ کے بڑے صاحبزادے ہیں، مولانا محمد شاہ عالم صاحب دوسرے اور حافظ قاری حسین عالم

صاحب تیسرے ہیں، اور چوتھے مولانا مفتی ظہیر احمد قاسمی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے پوتوں اور نواسوں کو بھی علم دین سے زینت بخشی۔ آپ کے صاحبزادوں اور صاحبزادیوں اور ان کے بیٹوں، بیٹیوں، پوتوں، نواسوں میں ڈیڑھ درجن سے زائد علما، قراء اور حفاظ ہیں۔

حضرت منشی جی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیشہ آخرت کو فوقیت دی۔ سادی زندگی گذاری، اولاد کو کبھی اپنے معاملات اور خواہشات میں مجبور نہیں کیا، سب نے مل کر درخواست کی کہ آپ گھر میں رہیں اور آرام فرمائیں۔ جب یہ مطالبہ زیادہ ہی بڑھ گیا تو گھر میں قیام پذیر ہوگئے۔ علالت کے باعث مسجد تک جانا دشوار ہوتا تھا اس لئے جمعہ کے علاوہ باقی نمازیں نہایت پابندی سے گھر میں ادا فرماتے اگر چند افراد اتفاقاً جمع ہوگئے تو جماعت کو ترجیح دیتے۔

کبھی عید، بقرعید اور شادی بیاہ کے موقع پر بیٹے بیٹیاں جمع ہوجاتے تو سب کو اپنے پاس بٹھا کر خوش ہوتے اور کسی سے، قرأت، کسی سے حمد ونعت، کسی سے تقریر، اور کبھی مسائل پر گفتگو، گویا ایک اچھا خاصا پروگرام یا جلسہ گھر میں ہی ہوجاتا تھا، اور حسب مراتب انعام سے بھی نوازتے تھے۔ اور خوب تعریف فرماتے، حوصلہ بڑھاتے، مزاج میں چونکہ نظافت زیادہ تھی، اس لئے خلاف مزاج بات پر فوراً ٹوک دیتے تھے۔ مصلحت کو کبھی مدنظر نہ رکھتے۔ جیسے دل میں بات آئی ظاہر کر دی۔

اپنی خصوصی مجلس میں گھر والوں کو کبھی دنیا کمانے پر نہیں اکسایا۔ ہمیشہ اعمال صالحہ کے لئے نصیحت کرتے۔ آخرت کی فکر پر رونے لگتے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رفیق القلب بنایا تھا۔ چند سالوں سے فریش تھے۔ اور نقاہت ناقابل بیان حد تک آچکی تھی۔ آٹھ دن پہلے مظفرنگر سے بنگلور فون آیا تو ''منشی جی'' مرحوم بول رہے تھے۔ اپنی لاڈلی بیٹی شاہ جہاں (راقم الحروف کی بیوی) سے خوب ہنس کر بات کی اور پوچھا

حارث کے ابو کہاں ہیں؟.....بتایا کہ وہ سفر پر ہیں بہت سی دعائیں دیں.....فون رکھ دیا۔۱۲ر ذی الحجہ مطابق ۴ر فروری کی صبح طبیعت میں بے چینی سی پیدا ہوئی۔قریب پانچ کلومیٹر باغونوالی سے، بڑے صاحبزادے مولانا محمد عالم صاحب کو بلانے کے لئے کسی کو بھیجا۔محترمہ شاہ جہاں کو بار بار یاد کرتے رہے غشی کا عالم تھا۔ ہمیشہ ذکر واذکار میں رہتے۔ خاموشی سے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے۔گھر کے سبھی افراد موجود تھے۔مولانا شاہ عالم صاحب بنگلور سے طبیعت کی ناسازی کی اطلاع ملتے ہی فلائٹ سے پہنچ گئے۔لیکن لاڈلی بیٹی کی طبیعت (ابا کی علالت سن کر) اتنی خراب ہوئی کہ شگر، بی پی زیادہ ہوگئی اور ڈاکٹر نے سفر کے لئے منع کردیا۔مجبوراً ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی نے اپنے ماموں مولانا شاہ عالم سے ائرٹکٹ واپس کرادیا کہ امی علیل ہیں اور اس وقت سفر ممکن نہیں، بہر حال وقتِ آخر آن پہونچا تھا۔۴ر فروری کو بعد نماز ظہر ''حضرت قبلہ منشی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔اللہ تعالیٰ حضرت قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی بال بال مغفرت فرمائے، اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین!

آخری ایام میں بھائی محمد ذوالفقار صاحب، اور عزیزہ قمر جہاں صاحبہ اور ان کے بچوں نے دن رات، دل وجان سے خدمت کی، اور ایک لمحہ بھی غافل نہیں رہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پروردگار عالم ان حضرات کو دونوں جہاں میں اس کا نعم البدل عطا فرمائے۔آمین! کھالہ پار مظفر نگر کے قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔کثیر جماعت کثیر افراد کی شرکت رہی آج چمنستان شفیع اداس اداس ہے۔

فسردہ کلیاں، اداس غنچے، گلوں کے چہروں کا رنگ پھیکا
ضرور گذری ہے گلستاں پہ کوئی نئی واردات ساقی

☆☆☆

چرتھاول کے تین بزرگ [۲۵]

حافظ سعید احمد صاحبؒ

مجھے اچھی طرح یاد ہے میری عمر اس وقت بمشکل چار برس ہوگی۔ یا اس سے بھی کم کہ میرے دادا جان محمد سلیمان صاحب مرحوم ومغفور مجھے حضرت حافظ سعید احمد صاحب کی درسگاہ واقع کاشف العلوم چرتھاول میں بیٹھا کر آئے اور پھر تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔حضرت حافظ صاحب نے کم بیش پچاس سال تک درس وتدریس کی خدمت انجام دیں نہایت سادگی اور سادگی بھی ایسی جس پر قربان ہونے کو دل چاہے پاکیزہ اور نورانی شخصیت کہ فرشتے بھی ان کے دامن پر نماز پڑھیں۔کبھی کبھی حضرت کو درسگاہ میں نیند آجاتی تو نیند میں قرآن مجید کے کئی کئی رکوع پڑھ دیا کرتے تھے اتنا شغف تھا قرآن مجید سے۔ ہمارے بچپن میں ان کی تنخواہ ۲۰ر روپئے سے بھی کم ہی تھی اسی میں گذارہ ہوتا تھا حضرت کے ہزاروں علماء حفاظ اور قراء کرام شاد گرد ہیں کبھی کسی سے کوئی طمع اور لالچ کی بات نہیں کسی سے کوئی امید نہیں جو بھی بات ہوتی صاف ستھری بات کرتے تصنع سے پاک۔آٹھ سال قبل چرتھاول جانا ہوا تو دل چاہا کہ حافظ

[۲۵] انوار السالکین، مولف محمد ادریس حبان رحیمی بنگلور

صاحب کی زیارت اور ملاقات کر آؤں اور دعائیں لے لوں۔ کاشف العلوم کے نچلے حصہ میں جو تالاب کو پاٹ کر مدرسہ کا حصہ بنایا گیا ہے سردی کے موسم میں دھوپ میں بیٹھ کر وہی بغدادی قاعدہ جو ہم لوگوں نے حضرت سے پڑھا تھا پڑھا رہے تھے دیکھ کر کھڑے ہوئے گئے مجھے شرمندگی ہوئی عرض کیا حضرت میں آپکا شاگرد ہوں آپکی جوتیاں سیدھی کرنے والا، فرمایا بھائی کون ہو؟ میں نے تو پہچانا نہیں، میں نے عرض کیا حضرت! محمد ادریس حبان رحیمی ہوں مسکرا کر فرمایا اچھا اچھا بھائی میں نے تو سمجھا کہ دیوبند سے کوئی بڑے عالم صاحب آئے ہیں۔ کچھ دیر حضرت کے پاس بیٹھا اور دعائیں لے کر واپس ہوا لیکن کم نصیبی دوبارہ پھر ملاقات نہ ہوسکی۔ گذشتہ سال حضرت کا وصال ہوا تو جنازہ کی نماز میں اور پھر قبرستان جاتے ہوئے لاکھوں کا مجمع تھا نہ کوئی اخبار یا ریڈیو ٹیلی ویژن سے خبر دی گئی تھی لیکن دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے فرشتے جنازہ میں شریک ہیں۔ شیخ الحدیث نہیں تھے ناظرہ قرآن مجید اور ابتدائی تعلیم والے بچوں کو پڑھاتے ساری عمر گذار دی۔ میرے والد محترم اور مولانا محمد قاسم صاحب اور دیگر حضرات نے بھی بتایا کہ اس دن تو نہ معلوم اتنا مجمع کہاں سے آگیا تھا اور کئی ایسے مجذوب اور خدا رسیدہ بندوں کی اہل نظر نے آمد دیکھی جو صرف حافظ صاحب کے جنازہ میں شریک تھے بعد میں ان کو نہیں دیکھا گیا اللہ تعالی حضرت حافظ صاحب کو غریق رحمت فرمائے اور درجات بلند فرمائے آمین اور ہزاروں شاگردوں کی جانب سے انکو جزائے خیر اور نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت منشی عبدالوحید صاحب

حضرت مولانا منشی عبدالوحید صاحب دامت برکاتہم حافظ سعید احمد صاحب کے بڑے بھائی ہیں کاشف العلوم میں پچاس سال سے زائد ہوگئے تعلیمی خدمات

انجام دے رہے ہیں راقم الحروف کو حضرت سے ناظرہ قرآن اور ابتدائی اردو دینیات پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اس ناکارہ نے حضرت کو نہایت قریب سے دیکھا کبھی کوئی فتنہ یا اختلاف والا مزاج نہ پایا ہمہ وقت فکر آخرت، اور ملت کی دردمندی، اور قوم وملت کے بچوں کی تعلیم کی فکر میں منہمک رہتے ہیں اور بعد نماز عصر قبرستان گور غریباں عام قبرستان جانا آپ کا معمول رہا۔ بچپن سے ہم نے دیکھا کہ آپ ہر روز بعد نماز عصر قبرستان جا کر ایصال ثواب کر کے واپس آتے ایک ہی مسجد میں امامت کرتے ہوئے پچاس سال ہوگئے نہ کبھی تنخواہ بڑھانے کا سوال اور نہ دنیوی ترقی کا خیال، بس جیسے سیدھے سادھے پچاس سال قبل تھے آج بھی ویسے ہی ہیں لباس میں سادگی رہائش اور گفتگو میں سادگی اور کبھی زبان سے غرور، گھمنڈ یا بڑائی والی بات نہیں راستہ میں مدرسہ سے گھر جاتے آتے قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر اللہ آپ کا معمول ہے اس وقت ضعیف العمر ہیں اللہ تعالی حضرت کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور آپ کے فیض کو تادیر قائم ودائم رکھے اور ہم جیسے ہزاروں شاگردوں کی طرف سے حضرت کو اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ یہ حضرات نہ صرف ملت کا سرمایہ ہیں بلکہ سرمایہ افتخار ہیں اور ہمارے لئے نمونۂ عمل۔ اللہ تعالی ان حضرات کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

قاری عبدالقدوس صاحب قاسمی

آپ دونوں پاؤں سے معذور تھے کھڑے نہیں ہوسکتے تھے اسی حالت میں آپ نے دارالعلوم دیوبند سے شعبۂ قرأت سے سند حاصل کی فراغت کے بعد چرتھاول کے مدرسہ کاشف العلوم میں آپ کو حضرت مولانا رفیق احمد صاحب سابق مہتمم لے کر آئے۔ استقلال ایسا کہ ساری عمر گذار دی اس ناچیز کو تجوید وقرأت پڑھنے

اور سیکھنے کا شرف تملذ حضرت قاری صاحب سے حاصل ہے ہمارے بچپن میں آپ تجوید وقرأت کے بڑے اساتذہ شامل تھے۔اللہ تعالی نے چہرے پر حسن و جمال اور نور ایسا عطا فرمایا تھا کہ جو دیکھتا دیکھتا ہی رہ جاتا۔اور آواز میں لحن داؤدی کا عنصر تھا۔اہل خانہ کیساتھ چرتھاول مدرسہ کاشف العلوم کے احاطہ ہی رہتے تھے۔آپ ان پرانے چہروں اور بزرگوں میں سے تھے جن کو دیکھ کر اللہ تعالی کی یاد اور فکر آخرت پیدا ہو جاتی تھی۔میرے ساتھی حافظ قاری محمد اشرف صاحب جو اس وقت بہاری میں درس قرآن کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی بڑی خدمت کی اور ان سے بڑی دعائیں لیں۔ انکے نازک وقت میں اور ضرورت کے اوقات میں شاید حافظ محمد اشرف صاحب سے زیادہ کوئی شاگرد انکے کام نہیں آیا۔اللہ تعالیٰ حضرت قاری صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ان حضرات کی دینی خدمات تصوف اور معرفت کے درجات سے کم نہیں تھیں کہ استقلال انکی عادت ثانیہ تھا اور کبھی پیسے کے لالچ میں اس جگہ سے اس جگہ اور یہاں سے وہاں جانا گوارہ نہیں کیا کم تنخواہ میں اعلی خدمات انجام دیں اور قناعت کیساتھ دین کے کام میں لگے رہے اور اپنے اعلی اخلاق اور کردار سے اپنے شاگردوں کے قلوب کو جلا بخشی۔اور کبھی کسی سے شکوہ نہیں کیا ان کا طرز زندگی ہم جیسے لوگوں کیلئے نمونۂ عمل اور زندگی کیلئے مشعل راہ ہے۔

☆☆☆

۲۶

علمائے دیوبند

امیر شاہ خان صاحب مرحوم راوی ہیں کہ جب منشی ممتاز علی کا مطبع میرٹھ میں تھا، اس زمانے میں ان کے مطبع میں مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ملازم تھے۔اور ایک حافظ جی بھی نوکر تھے، یہ حافظ جی بالکل آزاد تھے، رندانہ وضع تھی، چوڑی دار پاجامہ پہنتے تھے، داڑھی چڑھاتے تھے، نماز کبھی نہ پڑھتے تھے، مگر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی نہایت گہری دوستی تھی، وہ مولانا کو نہلاتے اور کمر ملتے تھے، مولانا ان کے کنگھار کرتے تھے، اور وہ مولانا کے کنگھار کرتے تھے، اگر کبھی مٹھائی وغیرہ مولانا کے پاس آتی تو ان کا حصہ ضرور رکھتے تھے، غرض بہت گہرے تعلقات تھے، مولانا کے مقدس دوست ایسے آزاد شخص کے ساتھ مولانا کی دوستی سے ناخوش تھے، مگر وہ اس کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ جمعہ کا دن تھا، حسب معمول مولانا نے حافظ جی کو نہلایا، اور حافظ جی نے مولانا کو، جب نہا چکے تو مولانا نے فرمایا: حافظ جی! مجھ میں اور تم میں دوستی ہے اور یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تمہارا رنگ اور ہو اور میرا رنگ اور، اس لئے میں بھی تمہاری ہی وضع اختیار کر لیتا ہوں، تم اپنے کپڑے لاؤ، میں بھی وہی کپڑے پہنوں گا اور میری یہ داڑھی موجود ہے، تم اس کو بھی چڑھا دو، اور

میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نہ کپڑے اتاروں گا نہ داڑھی، وہ یہ سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور کہا کہ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ آپ مجھے اپنے کپڑے دیجئے، میں آپ کے کپڑے پہنوں گا اور یہ داڑھی موجود ہے، اس کو آپ اتار دیں، چنانچہ مولانا نے ان کو کپڑے پہنائے اور داڑھی اتار دی اور وہ اس روز سے پکے نمازی اور نیک وضع بن گئے۔ (مجالس حکیم الامت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب صفحہ:۵۸)

مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ

دارالعلوم دیوبند کے دوسرے مہتمم حضرت مولانا رفیع الدین صاحب کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، ایک مرتبہ انہوں نے محسوس کیا کہ بعض حضرات مدرسین دارالعلوم کے مقررہ وقت سے کچھ دیر میں آتے ہیں، تو آپ نے حاکمانہ محاسبہ کے بجائے یہ معمولی بنالیا کہ روزانہ صبح کو دارالعلوم کا وقت شروع ہونے پر دارالعلوم کے دروازے کے قریب ایک چار پائی ڈال کر اپر بیٹھ جاتے اور جب کوئی استاذ آتے تو سلام ومصافحہ اور دریافت خیریت پر اکتفا فرماتے، زبان سے کچھ نہ کہتے کہ آپ دیر سے کیوں آئے ہیں؟ اس حکیمانہ سرزنش نے تمام درسین کو وقت کا پابند بنادیا۔

البتہ صرف ایک مدرس اس کے بعد بھی کچھ دیر سے آتے تھے، ایک روز جب وہ وقت مقررہ کے کافی بعد مدرسہ میں داخل ہوئے تو سلام اور دریافت خیریت کے بعد انہیں پاس بٹھا کر فرمایا: ''مولانا! میں جانتا ہوں کہ آپ کے مشاغل بہت ہیں، ان کی وجہ سے دارالعلوم پہونچنے میں دیر ہوجاتی ہے، ماشاء اللہ آپ کا وقت بڑا قیمتی ہے اور میں ایک بے کار آدمی ہوں خالی پڑا رہتا ہوں آپ ایسا کریں کہ اپنے گھریلو کام مجھے بتلادیا کریں، میں خود جاکر ان کو انجام دے دیا کروں گا تاکہ آپ کا وقت تعلیم کے لئے فارغ ہوجائے''۔

اس حکیمانہ طرز خطاب کا جو اثر ہونا تھا وہ ہوا اور وہ مدرس بھی آئندہ ہمیشہ کے لئے وقت کے پابند ہوگئے۔ (مجالس حکیم الامت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، ص:۶۰-۶۲)

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اصلاح خلق کی توفیق خالص اور اس کا انتہائی حکیمانہ اسلوب مرحمت فرمایا تھا۔ اردو کے مشہور شاعر جناب جگر مرادآبادی مرحوم کا واقعہ ہے کہ ایک مجلس میں حضرت خواجہ عزیزالحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ذکر کیا کہ ''جگر مرادآبادی سے ایک مرتبہ میری ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگے کہ تھانہ بھون جانے اور زیارت کرنے کو بہت دل چاہتا ہے۔ مگر میں اس مصیبت میں مبتلا ہوں کہ شراب نہیں چھوڑ سکتا، اس لئے مجبور ہوں کہ کیا منہ لے کر وہاں جاؤں؟'' حضرت نے خواجہ صاحب سے پوچھا: ''پھر آپ نے کیا جواب دیا؟'' خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ میں نے کہہ دیا ''ہاں! یہ تو صحیح ہے ایسی حالت میں بزرگوں کے پاس جانا کیسے مناسب ہوسکتا ہے؟'' حضرت نے فرمایا: ''واہ خواجہ صاحب! ہم تو سمجھتے تھے کہ اب آپ طریق کو سمجھ گئے ہیں، مگر معلوم ہوا کہ ہمارا خیال غلط تھا''۔ خواجہ صاحب کے تعجب پر حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا: کہ ''آپ کہہ دیتے کہ جس حال میں ہو اسی میں چلے جاؤ، ممکن ہے کہ یہ ملاقات ہی اس بلا سے نجات کا ذریعہ بن جائے''۔

چنانچہ خواجہ صاحب یہاں سے واپس گئے تو پھر اتفاقاً جگر صاحب سے ملاقات ہوگئی اور یہ سارا واقعہ جگر صاحب کو سنادیا۔ انہوں نے حضرت کے یہ کلمات سن کر زار زار رونا شروع کردیا۔ اور بالآخر یہ عہد کرلیا کہ اب مر بھی جاؤں تو اس خبیث چیز کے پاس نہ جاؤں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ شراب چھوڑنے سے بیمار پڑ

گئے۔ حالت نازک ہوگئی، اس وقت لوگوں نے کہا کہ آپ کو اس حالت میں بقدر ضرورت پینے کی تو شریعت بھی اجازت دے گی، لیکن یہ جگر صاحب کا جگر تھا کہ اس کے باوجود انہوں نے اس ام الخبائث کو ہاتھ نہ لگایا۔ اللہ تعالیٰ اہل عزم وہمت کی مدد فرماتے ہیں اس وقت بھی حق تعالیٰ کی مدد سے چند روز ہی میں شفاء کامل حاصل ہوئی۔ اس کے بعد وہ تھانہ بھون تشریف لائے اور حضرت نے ان کا بڑا اکرام فرمایا۔

(ارواح ثلاثہ، ص: ۱۷۵، نمبر: ۲۲۸)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات

غالباً شملہ کے کسی کالج میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہوا، وہاں آپ نے فرمایا کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کو جو شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ صرف نصاب تعلیم ہی کا قصور نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب وہ لادینی ماحول ہے جس میں ہماری نئی نسل پلتی اور ڈھلتی ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ بزرگ علماء وصلحاء کی مجلسیں بحمد للہ ہر جگہ کچھ نہ کچھ قائم ہیں، کچھ دن اس ماحول میں رہنے کی عادت ڈالیں۔ غالباً اسی مجلس میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کو انگریزی پڑھنے والوں سے نفرت ہے؟ حضرت نے فرمایا: کہ ''ہرگز نہیں، ان لوگوں سے کوئی نفرت نہیں، البتہ ان کے بعض اعمال وافعال سے نفرت ہے، جو شریعت کے خلاف ہیں'' یہ صاحب بولے: ''وہ اعمال وافعال کیا ہیں؟'' حضرت نے فرمایا: کہ ''مختلف لوگوں کے مختلف اعمال ہیں، سب یکساں نہیں''۔ یہ صاحب بھی خوب آزاد آدمی تھی، کہنے لگے کہ ''مثلاً مجھ میں کیا ہیں؟'' آج کے عام وضع طلباء کی طرح ان کی بھی داڑھی صاف تھی، حضرت نے فرمایا: ''بعض چیزیں تو ظاہر ہیں، مگر مجمع میں اس کا اظہار کرنے سے حیا مانع ہے اور آپ کے باقی حالات ومعاملات مجھے معلوم نہیں جس پر کوئی رائے ظاہر کرسکوں''۔

یہ جلسہ ختم ہوا، حضرت تھانہ بھون واپس آگئے، پھر اتفاقاً کالج کی تعطیل ہوئی تو ایک طالب علم کا خط آیا، خط میں لکھا تھا کہ ہماری اس وقت تعطیل ہے میں آپ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق کچھ دن آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہوں، مگر میری ظاہری صورت بھی شریعت کے مطابق نہیں اور اعمال وافعال میں بھی بہت گڑبڑ ہے، ان حالات میں حاضری کی اجازت ہو تو میں حاضر ہوجاؤں، حضرت نے تحریر فرمایا: ''جس حالت میں ہیں، چلے آئیں، کوئی فکر نہ کریں، یہ صاحب آگئے اور عرض کیا کہ مجھے بہت سے شبہات واشکالات ہیں، ان کو حل کرنا چاہتا ہوں، حضرت نے فرمایا: کہ مناسب ہے مگر اس کی صورت یہ کرنی ہوگی کہ آپ کے جتنے شبہات ہیں ان سب کو لکھ لیں اور آپ مجلس میں بیٹھ کر ہماری باتیں سنیں کوئی سوال نہ کریں، جب آپ کی مدت قیام کے تین دن رہ جائیں اس وقت یاد دلائیں تو میں آپ کو سوالات کا مستقل وقت دوں گا اور یہ بھی فرمایا کہ جو سوالات آپ لکھ رکھیں گے اس عرصہ میں کسی سوال کا جواب سمجھ میں آجائے تو اس کو کاٹ دیں۔ ان صاحب نے ایسا ہی کیا اور جب رخصت سے تین روز پہلے حضرت نے سوالات کا وقت دیا تو انہوں نے بتلایا کہ میرے سوالات کی بہت طویل فہرست تھی، مگر دوران قیام اکثر سوالات کے جواب خود سمجھ میں آگئے، انکو کاٹتا رہا، اب صرف چند سال باقی ہیں، چنانچہ یہ سوالات انہوں نے پیش کئے اور حضرت سے انکے جوابات پاکر ہمیشہ کیلئے مطمئن ہوگئے۔ (ارواح ثلاثہ، ص: ۲۱۱، نمبر: ۳۰۸)

مخالفین سے سلوک

اکابر دیوبند کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے مخالف مسلک والوں سے بھی بداخلاقی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے، نہ ان کی تردید میں دلآزار اسلوب کو پسند کرتے تھے اور نہ طعن آمیز القاب سے یاد کرنا پسند کرتے تھے، بلکہ جہاں تک ہوسکتا بداخلاقی

کا جواب خوش خلقی سے دیتے اور مخالفین کی دینی ہمدردی وخیر خواہی کو پیش نظر رکھتے تھے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خادم خاص حضرت امیر شاہ خان صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مولانا خورجہ تشریف لائے اور وہاں ایک مجلس میں مولوی فضل رسول بدایونی کا تذکرہ چل گیا۔ (چونکہ وہ مخالف مسلک کے تھے اس لئے) میری زبان سے (طنز کے طور پر) بجائے فضل رسول کے فصل رسول نکل گیا، مولانا نے ناخوش ہوکر فرمایا کہ ''لوگ ان کو کیا کہتے ہیں؟'' میں نے کہا 'فضل رسول'' آپ نے فرمایا: ''تم فصل رسول کیوں کہتے ہو؟'' حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''یہ حضرات تھے جو ''لاتَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ وَلاَ تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ'' کے پورے عامل تھے، حتی کہ مخالفین کے معاملہ میں بھی''۔

(ارواح ثلاثہ، ص:۲۸۵، نمبر:۴۳۲)

مولانا احمد رضا خان صاحب کی تعظیم

بریلی کے مولوی احمد رضا خان صاحب نے اکابر دیوبند کی تکفیر اور ان پر سب وشتم کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ ہر پڑھے لکھے انسان کو معلوم ہے، ان فرشتہ خصلت اکابر پر گالیوں کی بوچھار کرنے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، لیکن حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس دشنام طرازی کا سب سے بڑا نشانہ تھے، ایک روز اپنے شاگرد رشید حضرت مولانا یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: کہ ان کی تصنیف ہمیں سنادو۔ حضرت مولانا یحییٰ صاحب نے عرض کیا کہ ''حضرت! ان میں تو گالیاں ہیں''۔ اس پر حضرت گنگوہی نے فرمایا: ''اجی دور کی گالیوں کا کیا ہے؟ پڑی (یعنی بلا سے) گالیاں ہوں، تم سناؤ۔ آخر اس کے دلائل تو دیکھیں۔ شاید کوئی معقول بات ہی لکھی ہو تو ہم ہی رجوع کرلیں''۔ (حیات شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ از حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب، ص:۱۸۳)

اللہ اکبر! یہ ہے حق پرستوں کا شیوہ، کہ مخالفین بلکہ دشمنوں کی باتیں بھی ان کی دشنام طرازیوں سے قطع نظر، اس نیت سے سنی جائیں کہ اگر اس سے اپنی کوئی غلطی معلوم ہو تو اس سے رجوع کرلیا جائے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع

مولانا محمود صاحب رامپوری رحمۃ اللہ علیہ (جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے) فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں اور ایک ہندو تحصیل دیوبند میں کسی کام کو گئے۔ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مہمان ہوا اور وہ ہندو بھی اپنے بھائیوں کے گھر کھانا کھا کر میرے پاس آگیا کہ میں بھی یہاں ہی رہوں گا، اس کو ایک چارپائی دے دی گئی، جب سب سو گئے تو رات کو میں نے دیکھا کہ مولانا مہمان خانہ میں تشریف لائے، میں لیٹا رہا، اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر کوئی مشقت کا کام کریں گے تو میں امداد کروں گا ورنہ خواہ مخواہ اپنے جاگنے کا اظہار کرکے کیوں پریشان کروں میں نے دیکھا مولانا اس ہندو کی طرف بڑھے اور اس کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے پاؤں دبانے شروع کئے، وہ خراٹے لے کر خوب سوتا رہا۔ مولانا محمود صاحب کہتے ہیں کہ میں اٹھا اور عرض کیا کہ حضرت! آپ تکلیف نہ کریں، میں دبادوں گا، مولانا نے فرمایا: کہ تم جاکر سوؤ، یہ میرا مہمان ہے، میں ہی اس خدمت کو انجام دوں گا، مجبوراً میں چپ رہ گیا اور مولانا اس ہندو کے پاؤں دباتے رہے۔ (اشرف السوانح، صفحہ:۱/۷۲/۵۸)

جذبات کو پی کر فرمایا

مولانا احمد حسن صاحب پنجابی مدرس کانپور نے ''ابطال امکان کذب'' میں ایک مبسوط رسالہ تحریر کرکے شائع کیا جس میں حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اور

ان کے ہم عقیدہ حضرات کو فرقہ ضالہ مزداریہ میں (جو معتزلہ میں سے ایک گروہ ہے) داخل کر دیا اور اس پر تقریظ لکھنے والوں نے تو اکابر دین کی نسبت زبان درازی کی انتہا کر دی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کو یہ رسالہ دیکھ کر طیش تو بہت آیا، لیکن علم وتقویٰ کا مقام بلند ملاحظہ فرمایئے، کہ غیظ وغضب کے جذبات کو پی کر ارشاد فرمایا: ''ان گستاخ لوگوں کو برا کہنے سے تو اکابر کا انتقام پورا نہیں لیا جاسکتا، اور ان کے اکابر کی نسبت کچھ کہہ کر اگر دل ٹھنڈا کیا جائے تو وہ لوگ معذور بے قصور ہیں۔''

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمان ہونے کا اقرار کیا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ سے امت کو جو بے مثال نفع پہنچا وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت کے مواعظ کا فیض آج تک جاری ہے اور جن حضرات نے ان کا مطالعہ کیا ہو وہ جانتے ہیں کہ یہ مواعظ دین کی بیشتر ضروریات پر حاوی ہیں اور اصلاح وتربیت کے لئے بے نظیر تاثیر رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ جونپور میں آپ کا ایک وعظ ہونا تھا، وہاں بریلوی حضرات کا خاصا مجمع تھا، آپ کے پاس ایک بے ہودہ خط پہنچا جس میں چار باتیں کہی گئی تھیں، ایک تو یہ کہ تم جلا ہے ہو، دوسرے یہ کہ جاہل ہو، تیسرے یہ کہ کافر ہو، اور چوتھے یہ کہ سنبھل کر بیان کرنا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وعظ شروع کرنے سے پہلے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: کہ اس قسم کا ایک خط میرے پاس آیا ہے، پھر وہ خط سب کے سامنے پڑھ کر سنایا اور فرمایا کہ ''یہ جو لکھا ہے کہ تم جلا ہے ہو، تو اگر میں جلاہا ہوں بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ میں یہاں کوئی رشتے ناتے کرنے تو آیا نہیں، احکام الٰہی سنانے کے لئے حاضر ہوا ہوں، سو اس کو قومیت سے کیا علاقہ؟ دوسرے یہ چیز اختیاری بھی نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کو جس قوم میں چاہا پیدا فرمادیا۔ سب قومیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی

ہوئی ہیں اور سب اچھی ہیں، اگر اعمال واخلاق اچھے ہوں۔ یہ تو مسئلہ کی تحقیق تھی، رہی واقعہ کی تحقیق سو مسئلہ کی تحقیق کے بعد واقعہ کی تحقیق کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی، لیکن پھر بھی اگر کسی کو تحقیق واقعہ کا شوق ہی ہو تو میں آپ کو وطن کے عمائد کے نام اور پتے لکھوائے دیتا ہوں، ان سے تحقیق کر لیجئے، معلوم ہو جائے گا کہ میں جلاہا ہوں یا کس قوم کا؟ اور اگر مجھ پر اطمینان ہو تو میں مطلع کرتا ہوں کہ میں جلاہا نہیں ہوں، رہا جاہل ہونا، اس کا البتہ میں اقرار کرتا ہوں کہ میں جاہل بلکہ اجہل ہوں لیکن جو کچھ اپنے بزرگوں سے سنا ہے اور کتابوں میں دیکھا ہے اس کو نقل کر دیتا ہوں، اگ رکسی کو کسی بات کے غلط ہونے کا شبہ ہو اس پر عمل نہ کرے۔ اور کافر ہونے کو جو لکھا تو اس میں زیادہ قیل وقال کی حاجت نہیں، میں آپ صاحبوں کے سامنے پڑھتا ہوں:

''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ (صَلَّى اللّٰه تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمْ)''

حضرت تھانوی کی حکمت اور موعظت

اگر میں نعوذ باللہ کافر تھا بھی تو لیجئے اب نہیں رہا۔ آخر میں سنبھل کر بیان کرنے کی دھمکی دی گئی ہے اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ وعظ گوئی کوئی میرا پیشہ نہیں ہے جب کوئی بہت اصرار کرتا ہے، تو جیسا کچھ مجھے بیان کرنا آتا ہے، بیان کر دیتا ہوں، اگر آپ صاحبان نہ چاہیں گے تو میں ہرگز بیان نہ کروں گا۔ رہا سنبھل کر بیان کرنا تو ان کے متعلق صاف صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ میری عادت خود ہی چھیڑ چھاڑ کی نہیں ہے، قصداً کبھی کوئی ایسی بات نہیں بیان کرتا جس میں کسی گروہ کی دل آزاری ہو، یا فساد پیدا ہو، لیکن اگر اصول شرعیہ کی تحقیق کے ضمن میں کسی ایسے مسئلہ کے ذکر کی ضرورت ہی پیش آجاتی ہے، جس کا رسوم بدعیہ سے تعلق ہے تو پھر میں رکتا بھی نہیں

اس لئے کہ یہ صریح دین میں خیانت ہے، سب باتیں سننے کے بعد اب بیان کے متعلق جو آپ صاحبوں کی رائے ہو اس سے مطلع کر دیا جائے، اگر اس وقت کوئی بات کسی کے خلاف طبع بان کرنے لگوں تو فوراً مجھ کو روک دیا جائے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر کوی ادنی شخص بھی مجھے روک دے گا تو میں بیان کو فوراً منقطع کر دوں گا، اور بیٹھ جاؤں گا، بہتر تو یہ ہے کہ وہی صاحب روک دیں، جنہوں نے یہ خط بھیجا ہے یا اگر خود کہتے ہوئے انہیں شرم آئے یا ہمت نہ ہو تو چپکے سے کسی اور ہم کو سکھلا پڑھا دیں ان کی طرف سے وہ مجھے روک دیں۔

یہ سن کر ایک معقولی مولوی صاحب جو بدعتی خیال کے تھے اور جن کا وہاں بہت اثر تھا، کڑک کر بولے: ''یہ خط لکھنے والا کوئی حرام زادہ ہے آپ وعظ کہئے۔ آپ کیسے فاروقی ہیں؟ حضرت نے فرمایا: میں ایسی جگہ کا فاروقی ہوں جہاں کے فاروقیوں کو یہاں کے لوگ جلاہے سمجھتے ہیں''۔

جب سارا مجمع خط لکھنے والے کو برا بھلا کہنے لگا خاص طور سے وہ مولوی صاحب فحش فحش گالیاں دینے لگے تو حضرت والا نے روکا کہ'' گالیاں نہ دیجئے، مسجد کا تو احترام کیجئے''۔ پھر حضرت والا کا وعظ ہوا اور بڑے زور شور کا وعظ ہوا۔ اتفاق سے دوران وعظ بلا قصد کسی علمی تحقیق کے ضمن میں کچھ رسوم و بدعات کا بھی ذکر چھڑ گیا پھر تو حضرت والا نے بلا خوف لومۃ لائم خوب ہی رد کیا، لوگوں کو یہ اختیار دے چکے تھے کہ وہ چاہیں تو وعظ کو روک دیں، لیکن کسی کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ معقولی مولوی صاحب شروع شروع میں تو بہت تحسین کرتے رہے اور بار بار سبحان اللہ سبحان اللہ کے نعرے بلند کرتے رہے، کیونکہ اس وقت تصوف کے رنگ پر بیان ہو رہا تھا، لیکن جب رد بدعات ہونے لگا تو پھر چپ ہو گئے مگر بیٹھے سنتے رہے، یہ بھی خدا کا بڑا فضل تھا کیونکہ بعد کو معلوم ہوا کہ وایسے کٹر اور سخت ہیں کہ جہاں کسی واعظ نے کوئی بات خلافت طبع

کہی، انہوں نے وہیں ہاتھ پکڑ کر منبر سے اتار دیا۔ لیکن اس وقت انہوں نے دم نہیں مارا، چپکے بیٹھے سنتے رہے، لیکن جب وعظ ختم ہوا اور مجمع رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہو گیا تو اس وقت ان مولوی صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ ''ان مسائل کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس پر ایک دوسرے ذی اثر مولوی صاحب (جو خود بدعتی خیال کے تھے) بڑھے اور جواب دینا چاہا لیکن حضرت والا نے انہیں روک دیا کہ خطاب مجھ سے ہے، آپ جواب نہ دیں، مجھے عرض کرنے دیں، پھر حضرت والا نے ان معقولی مولوی صاحب سے فرمایا: ''آپ نے یہ بات پہلے مجھ سے نہ فرمائی، ورنہ میں اختیار کرتا، میں نے تو جو کچھ بیان کیا ضروری ہی سمجھ کر کیا، مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ اب تو بیان ہو چکا۔ ہاں! ایک صورت اب بھی ہو سکتی ہے وہ یہ کہ ابھی تو مجمع موجود ہے، آپ پکار کر کہہ دیجئے کہ صاحبو! اس بیان کی کوئی ضرورت نہ تھی، پھر میں آپ کی تکذیب نہ کروں گا، اور آپ ہی کی بات اخیر رہے گی''۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے اور مولوی صاحب وہاں سے رخصت ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد سب لوگ ان کو برا بھلا کہنے لگے۔ جب بہت شور غل ہوا تو حضرت والا نے کھڑے ہو کر فرمایا: کہ ''صاحبو! ایک پردیسی کی وجہ سے آپ مقامی علماء کو ہرگز نہ چھوڑیں، میں آج مچھلی شہر جا رہا ہوں، اب آپ صاحبان یہ کریں اور میں ان صاحب کو بالخصوص یہ خطاب کرتا ہوں، جنہوں نے خط بھیجا ہے کہ وہ میرے بیان کا رد کرا دیں، پھر دونوں راہیں سب سامنے ہوں گی جو جس کو چاہے اختیار کرے، فساد کی ہرگز ضرورت نہیں'' پھر ان دوسرے مولوی صاحب نے (جو بدعتی خیال کے ہونے کے باوجود حمایت کے لئے آگے بڑھے تھے) کھڑے ہو کر فرمایا: کہ ''صاحبو! آپ جانتے ہیں کہ میں مولود یہ بھی ہوں، قیامیہ بھی ہوں مگر انصاف اور حق یہ ہے کہ جو تحقیق آج مولوی صاحب نے بیان فرمائی ہے صحیح وہی ہے''۔ احقر نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع

صاحب مدظلہم سے سنا ہے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں سے کسی صاحب نے اہل بدعت کی تردید میں ایک رسالہ لکھا تھا، اہل بدعت نے اس کا جور دلکھا، اس میں انہیں کافر قرار دیا۔ اس عمل کے جواب میں ان صاحب نے دو شعر کہے:

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دروغے را جزا باشد دروغے

جھوٹ کا چراغ نہیں جلتا

''تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں، کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اسکے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا، کیونکہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے''

انہوں نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ شعر سنائے، تو آپ نے شعری لطافت کی تو تعریف فرمائی، لیکن ساتھ ہی ارشاد ہوا کہ ''تم نے ان کو لطافت کے ساتھ ہی سہی، کافر تو کہہ دیا، حالانکہ فتویٰ کی رو سے وہ کافر نہیں ہیں، اس لئے ان اشعار میں اس طرح ترمیم کرلو۔

مرا کافر اگر گفتی غمے نیست
چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلمانت بخوانم در جوابش
دہم شکر بجائے تلخ دروغے
اگر تو مومنی فبہا، والا
دروغے را جزا باشد دروغے

(تم نے مجھے کافر کہا، مجھے اس کا غم نہیں، کیونکہ جھوٹ کا چراغ جلا نہیں کرتا، میں اس کے جواب میں تمہیں مسلمان کہوں گا اور تلخی کا جواب شیرینی سے دوں گا، اگر تم واقعی مومن ہو تو خیر ورنہ جھوٹ کی سزا جھوٹ ہی ہوسکتی ہے)

یہ چند واقعات ہیں جو کسی خاص اہتمام اور تحقیق وجستجو کے بغیر زیر قلم آگئے۔ اس مختصر مضمون میں اس قسم کے واقعات کا احاطہ مقصود نہیں۔ اگر کوئی بندہ خدا مزید تحقیق وجستجو اور مطالعہ کے بعد ان حضرات کے ایسے واقعات کو یکجا کردے تو علم ودین کی بڑی خدمت ہو لیکن مذکورہ چند واقعات اکابر دیوبند کے حسن وجمال کی ایک جھلک دکھانے کے لئے امید ہے۔ **واللہ الحمد اولا وآخر.**

☆☆☆

بحمداللہ تعالیٰ

''اُمت کے روشن چراغ'' جلد سوم کتاب کی تکمیل ہوئی۔

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ .

ڈاکٹر محمد سفیان عالم رحیمی
رحیمی شفاخانہ بنگلور کرناٹک

مورخہ ۲۷/جنوری ۲۰۱۴ء
مطابق ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۵ھ بروز پیر